سیاسی جماعتوں کے نام

پاکستان میں ابھی شاید مزید سیاسی پارٹیوں کی گنجائش موجود ہے۔ جبھی تو کراچی میں ایک نئی سیاسی پارٹی کا ڈول ڈالا گیا ہے۔ نام "غریب عوام پارٹی" ہے۔ پارٹی کے چیئرمین جناب نذیر حسین ایڈووکیٹ ہیں اور حال ہی میں خبر آئی کہ نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم کے چھوٹے بھائی نواب زادہ صداقت علی خاں نے اس پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی ہے۔ پارٹی کے قیام کے بارے میں ایک پریس کانفرنس بھی ہو چکی ہے مگر افسوس کہ اس کی کارروائی ہماری نظر سے نہیں گزری۔ ہمیں تو پارٹی کی یہی ادا مزہ دے گئی کہ اس کا نام "غریب عوام پارٹی" ہے مگر اس میں شمولیت نوابزادہ صاحب نے فرمائی ہے۔

پارٹی کا نام اگر صرف "عوام پارٹی" ہوتا تو جب بھی کام چل جاتا۔ عوام کے ساتھ "غریب" کی صفت لگانے سے پارٹی والوں کا نہ جانے کیا مقصد ہے۔ عوام غریب ہی ہوتے ہیں۔ وہ غریب نہ ہوں تو خواص بن جائیں۔ غربت "عوام" کے مفہوم میں پوشیدہ ہے۔ جو عوام ہوتا ہے۔ وہ امیر نہیں ہوتا' غریب ہوتا ہے۔ اور جو غریب ہوتا ہے' وہ عوام نہیں ہوتا' خواص ہوتا ہے۔ ممکن ہے عوام کے ساتھ غریب کا سابقہ لگاکر عوام کے عوامی پن یا غریب کی غربت میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہو جیسے جب ہم نے ایک سیاسی لیڈر سے پوچھا تھا کہ وہ سیدھے سادے لفظ عوام

کو واؤ کی تشدید کے ساتھ "عوام" کیوں بولتے ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا تھا۔ "زور پیدا کرنے کے لئے!"

اب جبکہ "غریب عوام پارٹی" قائم ہوگئی ہے' امراء کیوں کسی سے پیچھے رہیں' چنانچہ انہیں بھی اپنی ایک الگ پارٹی قائم کر ڈالنی چاہئے اور اس کا نام "امیر خواص پارٹی" ہونا چاہئے۔ جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں' خواص کے ساتھ امیر کی صفت لگانا بظاہر بے معنی ہے کیونکہ خواص' امیر ہی ہوتے ہیں اور امیر' خواص ہی ہوتے ہیں' جو صاحب بھی یہ پارٹی قائم کریں' وہ سب سے پہلے تو ایک پریس کانفرنس برپا کریں اور اس کے بعد اس "امیر خواص پارٹی" میں کسی عوام قسم کے آدمی کی شمولیت کا اعلان کیا جائے' جیسے "غریب عوام پارٹی" میں ایک خواص قسم کی شخصیت کی شمولیت کا اعلان ہوا ہے۔

ویسے یہ عجیب و غریب بات ہے۔ غریب عوام پارٹی اور کسان مزدور پارٹی اور محنت کش پارٹی وغیرہ تو قائم ہوتی رہتی ہیں مگر آج تک امیر خواص پارٹی یا خاندانی رئیس پارٹی یا باثروت پارٹی کبھی قائم نہیں ہوئی۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ہمارے ملک میں غربا اور عوام اور کسان اور مزدور اور محنت کش ہی آباد ہیں اور یہ سرزمین امراء اور خواص اور رؤسا اور ارباب ثروت سے خالی ہے' حالانکہ یہ غلط تاثر ہے۔ پھر سیاست میں یہ لوگ علی الاعلان کیوں شامل نہ ہوں۔ وہ دوسری پارٹیوں کے فرنٹوں میں کیوں لپٹے پھریں۔ آخر عوام کی طرح خواص بھی تو ہمارے ووٹر ہیں اور ہر ووٹر کو ایک سیاسی نظریہ رکھنے کا حق حاصل ہے۔ مثلاً" ایک صاحب کہا کرتے تھے کہ ووٹر صرف اسے ہونا چاہیے جس کے پاس موٹر ہے۔ آپ اس پر ہنسیں گے مگر حق بات یہ ہے کہ ان صاحب کو یہ نظریہ رکھنے کا حق حاصل تھا۔

آئندہ انتخابات سے کچھ روز پہلے ہم بھی ایک سیاسی پارٹی قائم کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ نام ہوگا ___ "عوام خواص پارٹی" ___ آپ کہیں گے یہ چوں چوں کا مربہ کیا ہوا اور ہم عرض کریں گے کہ یہ سب کی پارٹی ہے۔ اس کے لئے ہم بورڈ

لکھوالیا ہے۔ پیڈ بھی چھپوا لئے ہیں جن پر ہم نے اپنا نام فی الحال بطور "سرپرست اعلیٰ" درج کیا ہے کہ جب پارٹی بن جائے گی اور اس کے الیکشن ہوں گے تو تب کوئی مناسب سا عہدہ حاصل کرلیا جائے گا۔ ہم نے اس کے انتخابی منشور کی تیاری بھی شروع کر دی ہے۔ منشور کمیٹی میں عوام و خواص سبھی کے نمائندے شامل ہیں۔ ابتدائی دو جلسوں میں تو ہاتھ پائی تک نوبت پہنچی مگر ہمارا اندازہ ہے کہ آئندہ اجلاس پر امن ہوں گے۔ عوام و خواص دعا فرمائیں۔

ہمارے ایک شناسا ہیں۔ وہ "مہنگائی پارٹی" قائم کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ ہم سے مشورہ لینے آئے تو ہم نے عرض کیا کہ اس نام کے آگے پیچھے بھی تو کچھ لگائیے۔ موجودہ نام سے تو یہ تاثر ملتا ہے کہ آپ مہنگائی میں مزید اضافے کے لئے میدان میں اترے ہیں، حالانکہ آپ کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا۔ ہم نے ان کی پارٹی کے لئے "اینٹی مہنگائی پارٹی" کا نام تجویز کیا تو وہ "اینٹی" سے بہت چونکے اور حوالے کے لئے اینٹی کرپشن محکمے اور اینٹی ملیریا ادارے کا ذکر کرنے لگے کہ دونوں ایسٹیوں کے باوجود کرپشن بھی موجود ہے اور ملیریا بھی۔ "پرو مہنگائی" کا نام سرے سے غلط ہے اس لئے صرف "مہنگائی پارٹی" کافی ہے۔ "سستی پارٹی" بھی ٹھیک نام تھا مگر اس نام سے پارٹی کی تضحیک کا پہلو بھی نکلتا ہے کہ بہت "چیپ" پارٹی ہے! آپ کا کیا خیال ہے؟

(۱۹۷۷ء)

سیاسی جماعتوں کی اقسام

ایک سیاسی رہنما نے کہا ہے کہ اگر مقررہ وقت پر انتخابات ہوئے تو کاغذی جماعتیں ختم ہو جائیں گی۔ اس پر ایک صاحب ہم سے پوچھنے لگے کہ یہ کاغذی جماعتیں کیا ہوتی ہیں؟ عرض کیا کہ جانی پہچانی جماعتوں کے سوا جو بھی جماعتیں ہوتی ہیں وہ کاغذی ہوتی ہیں، یعنی ان کا نام صرف کاغذ پر درج ہوتا ہے، عوام الناس کے دلوں پر نقش نہیں ہوتا۔ یہ صاحب کہنے لگے کہ ممکن ہے متذکرہ رہنما کا بعض جماعتوں کو کاغذی کہنے سے مقصد یہ ہو کہ جس طرح اصلی پھولوں کے مقابلے میں مصنوعی پھول ہوتے ہیں جو کاغذ سے تیار کئے جاتے ہیں اسی طرح بعض جماعتوں کو کاغذ کہہ کر انہوں نے کسی کے اس مشہور مصرعے کی طرف اشارہ کیا ہو:

کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

ہم نے سوچا کہ اگر ہم ان کی تردید کرتے ہیں تو بات بڑھ جائے گی اس لیے یہی کہنے پر اکتفا کی کہ "ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔" پھر ہم نے انہیں بتایا کہ یہ منظم جماعتوں کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ تو صرف ان جماعتوں کا ذکر ہے جو بوقت ضرورت کھمبیوں کی طرح، کسی بیج کے بغیر زمین میں سے اگ آتی ہیں اور ان کی مختلف نوعیتوں کی رعایت سے ان کے مختلف نام ہو سکتے ہیں ___ مثلاً" مومی جماعتیں۔ آپ نے موم کی ناک تو سنا ہو گا۔ چنانچہ ان جماعتوں کو ذرا سا دھوپ میں

رکھنے کے بعد جدھر موڑو، مڑ جائیں گی۔

ان جماعتوں میں بعض نائلونی جماعتیں بھی ہو سکتی ہیں کہ ایک ماچس کا شعلہ بھی ان کے قریب سے گزرا نہیں اور وہ بھڑک کر خاکستر ہوئی نہیں۔ یہ نائلونی جماعتیں چولھے کے کہیں آس پاس پڑی ہوں تو ٹیڑھی میڑھی ہو کر رہ جائیں گی۔ مومی اور نائلونی جماعتوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہوتا۔ بس اتنا ہے کہ مومی جماعت ذرا دیر کو موم بتی کی طرح روشنی کرتی ہے اور پھر اپنے ہی قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہے اور پھر اپنے ہی قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہے مگر نائلونی جماعت کی تو راکھ بھی سمٹ کر چٹکی برابر رہ جاتی ہے۔

پھر "سائن بورڈی" جماعتیں ہوتی ہیں جو ایک اچھا سا اور بڑا سا سائن بورڈ لگانے کے بعد یہ سمجھ لیتی ہیں کہ وہ نہ صرف قائم ہو گئی ہیں۔ بلکہ چل رہی ہیں۔ ان سے ذرا بہتر "دفتری" جماعتیں ہوتی ہیں، جو محض ایک بورڈ پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ کرائے پر ایک آدھ کمرہ بھی لے لیتی ہیں اور رکنیت کے فارم چھپوا کر گاہکوں کا انتظار کرتی ہیں۔ مگر وہ جو "ہنگامی" جماعتیں ہوتی ہیں، وہ عجیب، و غریب چیزیں ہیں کہ ان کا کوئی بورڈ ہوتا ہے اور نہ دفتر۔ بس اچانک موقع پاکر سا جاتی ہیں۔ یوں کہنے کو یہ جماعتیں ہنگامی طور پر یعنی وقتی طور پر ابھرتی ہیں اور پھر ہمیشہ کی طرح بیٹھ جاتی ہیں۔ ہنگامی جماعتوں کے بارے میں یہ شبہ قطعاً" ناجائز ہے کہ وہ ہنگامے برپا کرنے کی وجہ سے ہنگامی کہلاتی ہیں۔ ان کا ہنگام صرف وقت سے نکلتا ہے۔

بعض غیر موثر سیاسی جماعتوں کی یہ اقسام گنواتے ہوئے ہمیں سند باد جہازی مرحوم یاد آ گئے جنہوں نے ایک بار "ناک" کی قسمیں لکھی تھیں۔ اب یاد نہیں مگر کچھ اس طرح کی بات تھی کہ ایک تو سیدھی سادی عام سی ناک ہوتی ہے، مگر ایک ناک "خوفناک" ہوتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر بعض ناکیں "ہولناک" ہوتی ہیں۔ پھر "دردناک"، "المناک" اور "غمناک" ناکیں ہوتی ہیں۔ انہوں نے شاید زکام زدہ ناکوں کو "نم ناک" کہا تھا اور اسی طرح ناکوں کی بے شمار اقسام گنواتے چلے گئے تھے۔

سیاسی جماعتوں کی بھی کچھ اسی طرح کی بے شمار قسمیں ہیں۔

مثلاً" اوپر کی مثالوں کے علاوہ بعض "الکشنی" جماعتیں بھی ہوتی ہیں جو صرف الکشن کے دنوں میں ظہور کرتی ہیں اور پھر غائب ہو جاتی ہیں۔ ان سے ہمیں سماجی اور معاشرتی بہبود کے وہ بے شمار ادارے (الا ماشاء اللہ) یاد آ گئے جو سیلاب کے دنوں میں کتم عدم سے عالم وجود میں آتے ہیں۔ سیلاب زدگان کے لئے چندے جمع کرتے ہیں۔ اشیائے خوراک اکٹھا کرتے ہیں اور پھر باقی زندگی امن اور چین کے ساتھ خدا کی یاد میں بسر کر دیتے ہیں۔ سیاسی دنیا کی کاغذی، مصنوعی، نقلی، مومی، نائلونی، سائن بورڈی، دفتر ہنگامی اور الکشنی جماعتیں بھی اسی قبیل کی چیزیں ہیں کہ ان کے بارے میں تحقیق کرنے نکلئے تو پورے پہاڑ کی کھدائی کے بعد ایک چوہا برآمد ہوتا ہے اور وہ بھی بہ رضائے الٰہی انتقال کر چکا ہوتا ہے۔

(۱۹۷۷ء)

شلوار قمیص

سرحد کے وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمود نے شلوار قمیص کو سرحد کا سرکاری لباس قرار دے کر کوٹ پتلون والوں سے بھی داد وصول کرلی ہے مگر یہ بات کسی کو نہیں سوجھی کہ مفتی صاحب نے دراصل اپنے ہی لباس کو سرکاری لباس بنا ڈالا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ مفتی صاحب نے اپنی ساری زندگی سرحد کا سرکاری لباس پہن کر گزاری ہے۔ انہیں کبھی کسی نے کوٹ پتلون میں نہیں دیکھا ہوگا۔ اگر کسی نے دیکھا ہے تو وہ اپنا ہاتھ کھڑا کردے۔ ہم شلوار سلوا دیں گے۔

جس شخص کی پوری زندگی شلوار قمیص میں گزری ہو' اسے اگر زندگی کے نصف آخر میں کوٹ پتلون میں ملبوس ہونا پڑے تو وہ بھلا معلوم نہیں ہوگا۔ چنانچہ ہم سوچتے ہیں کہ اگر ___ بفرض محال ___ مفتی صاحب مرکزی وزارت میں شامل ہو جاتے ہیں تو کیا وہ مرکزی کابینہ کا وہ مقررہ لباس پہننے پر رضامند ہو جائیں گے' جس میں مولانا کوثر نیازی بعض تقریبوں میں ملبوس نظر آتے ہیں؟ ہمارے خیال میں ہرگز نہیں۔ وہ تو اس لباس میں ایسے ہی لگیں گے جیسے نواب زادہ نصراللہ حقے کی بجائے سگرٹ پینے لگیں اور ٹوپی کی بجائے سر پر پگڑی رکھ لیں اور جمہوری پارٹی کو چھوڑ کر سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیں ___ ہمارا مطلب مختصراً" یہ ہے کہ مفتی صاحب اس لباس میں بہت عجیب لگیں گے۔

یہاں پنجاب میں بھی بیشتر لوگ سرحد کا قومی لباس پہننے کے عادی ہیں۔ خود ہم بھی شلوار قمیص کے بڑے رسیا ہیں مگر ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمارے وہ کوٹ پتلون پرانے ہی نہیں ہوتے جو ہم نے پندرہ برس پہلے سلوائے تھے۔ شلوار قمیص تو دھوبی کی پانچ چھ دھلائیوں کی مار ہے۔ چھٹی دھلائی کے بعد جب شلوار آپ کے پاس آئے گی اور آپ اس میں سے اپنی ٹانگ گزاریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پاؤں باہر نکالنے کے لئے پائنچے کے علاوہ شلوار میں متعدد راہیں پیدا ہو چکی ہیں اور قمیص قمیص عامری کی معلوم ہوتی ہے جو اسے پہنتا کم تھا اور پھاڑتا زیادہ تھا۔

پھر شلوار شلوار میں فرق ہوتا ہے۔ ایک شلوار تو وہ ہوتی ہے جو آج کل کی نوجوان لڑکیاں پہنتی ہیں کہ ان کی شلوار اور چست پاجامے میں بس ایک گھیر کا فرق ہوتا ہے۔ دوسری شلوار وہ ہے، جس کے تجربے میں سے ہم گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور کے تعاون سے گزرے تھے۔ بلکہ تجربے میں سے کہاں گزرے تھے، پوری شلوار میں سے گزر گئے تھے۔ چند برس پہلے کی بات ہے، میر صاحب، فیض صاحب کے ساتھ ہمیں بھی اپنے حیدر آباد کے دولت کدے پر لے گئے اور ہمارا سامان ہوٹل میں پڑا رہ گیا۔ ہم سوٹ میں ملبوس تھے اور دوسرے روز ہمیں یہی سوٹ پہن کر ایک تقریب میں حصہ لینا تھا۔ اس لئے ہم نے میر صاحب سے رات بھر کے لئے کوئی پاجامہ طلب کیا۔ پاجامہ میر صاحب نے عمر بھر نہیں پہنا۔ اس لئے وہ پاجامے کی بجائے اپنی شلوار اٹھا لائے۔

ہم نے جب اس شلوار کے ایک حصے میں اپنی ٹانگیں داخل کیں تو وہ داخل ہوتی چلی گئیں۔ ہم نے اس کا پائنچہ دریافت کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ ہنوز دلی دور است۔ پھر ہم نے سوچا کہ اگر یہ شلوار اتنی وسیع الرقبہ ہے تو کیوں نہ دونوں ٹانگیں شلوار کے ایک ہی پائنچے میں ڈال دیں اور شلوار کا دوسرا حصہ اوڑھ کر سو جائیں۔ مگر جب ہم دونوں ٹانگیں شلوار کے ایک حصے میں داخل کر چکے تو ابھی اس میں میلوں کی گنجائش تھی۔ چنانچہ ہم نے فیض صاحب سے عرض کیا کہ آپ بھی اس

ایک پائنچے میں آجائیے مگر افسوس کہ انہوں نے ہماری یہ بات قہقہے میں اڑا دی۔

وہ ایسی ہی شلوار تھی، جسے دھونے کے لئے دھوبی کو بلوایا گیا تو اس نے اسے اٹھا کر دیکھا اور دس منٹ تک دیکھتا چلا گیا۔ جب شلوار ختم ہوگئی تو وہ اسے ایک طرف ڈال کر جانے لگا۔ پوچھا شلوار کو چھوڑ کر کہاں چلے۔ دھوبی نے جواب دیا۔ "جی آپ نے تو شلوار دھونے کے لئے بلوایا تھا اور آپ تو مجھے "تنبو" دھونے کے لئے دے رہے ہیں، جسے اگر پھیلا دیا جائے تو اس کے نیچے پوری برات بیٹھ سکتی ہے" ـــــ سو مفتی صاحب یہ وضاحت بھی تو کریں کہ سرحد کے سرکاری لباس میں شلوار کون سے ڈیزائن کی ہوگی؟ کالج کی کسی طالبہ کی شلوار یا میر رسول بخش تالپور کی شلوار جس کے لئے ہم صیغہ تانیث استعمال کرنے کی معافی چاہتے ہیں کہ یہ گرامر کی مجبوری ہے ورنہ اسے شلوارا کہنا چاہئے۔

(۱۹۷۲ء)

بجٹ

یہ بچت کا زمانہ نہیں، بجٹ کا زمانہ ہے۔ اول تو بجٹ آنے سے پہلے ہی یار لوگ جو عوام کی بچت کے ایک ایک پیسے کا خفیہ حساب رکھتے ہیں، اشیاء میں قلت پیدا کرکے اور نرخوں کو آسمان پر چڑھا کے اس بچت پر جھاڑو پھیر دیتے ہیں۔ پھر بجٹ آتا ہے اور بچت کی رہی سہی کسر بھی نکل جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بجٹ میں چاہے نئے ٹیکس نہ لگائے گئے ہوں، بجٹ ساز مسمریزم کا کوئی ایسا کمال ضرور دکھاتے ہیں کہ ٹیکس ادا کرنے والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کا تو عرق اور ساتھ ہی کچومر تک نکال لیا گیا ہے۔ بجٹ سازی کا کمال ہی یہ ہے کہ عوام کی جیبوں کو بے خبری میں یا خوش فہمی میں خالی کرلیا جائے اور جب آیندہ بجٹ آنے پر عوام جیب میں ہاتھ ڈالیں تو یہ مصرع دہراتے رہ جائیں کہ:

صفائی عجب چیز دنیا میں ہے

عنقریب پاکستان کے عوام پر ایک نہ دو، پورے پانچ بجٹ دھاوا بولنے والے ہیں۔ چار صوبائی بجٹ اور ایک مرکزی بجٹ۔ صوبائی بجٹوں میں اہل صوبہ پر ٹیکس لگائے جائیں گے۔ مرکزی بجٹ میں اہل ملک پر ٹیکس لگائے جائیں گے۔ مگر جو عوام اہل صوبہ ہیں، وہی عوام اہل ملک ہیں اس لئے عوام کو دوہری مار پڑنے کا احتمال ہے۔ ایک محفل میں ہم نے اس خدشے کا ذکر کیا تو ایک صاحب بولے۔ "تشویش

کی ضرورت نہیں۔ ٹیکس تو ظاہر ہے کہ لگائے جائیں گے کیونکہ آخر حکومتوں کو حکومتیں بھی تو چلانا ہوتی ہیں۔ البتہ ایک سے زیادہ وزرائے اعلیٰ صاف صاف لفظوں میں اعلان کر چکے ہیں کہ ٹیکسوں کا بوجھ عوام پر نہیں ڈالا جائے گا۔ آپ اخبار نویس ہیں اس لئے عوام ہیں۔ چنانچہ آپ کا فکر مند ہونا بے معنی ہے۔"

اس پر ہمیں ایک معاصر کی یہ دعا یاد آگئی کہ خدا کرے' عوام کے علاوہ خواص پر بھی نئے ٹیکسوں کا بوجھ نہ پڑے کیونکہ خواص تو اپنے بٹوے اور بنک بیلنس کے سوا کوئی دوسرا بوجھ اٹھانے کے لائق ہی نہیں ہیں اس لئے وہ اپنا بوجھ بھی عوام کو منتقل کر دیتے ہیں اور عوام کو تیرا میرا بوجھ اٹھانے کے سوا اب تک کچھ سکھایا ہی نہیں گیا اس لئے وہ اپنے بوجھ کے علاوہ یہ بوجھ بھی چپکے سے اٹھا لیتے ہیں اور خواص حکومت کو مطلع کر دیتے ہیں کہ لیجئے آپ کا حساب بے باق ہوا۔

فرض کیجئے ایک نحیف و نزار ٹٹو پر ایک لحیم شحیم سوار بیٹھا ہے۔ ٹٹو تن بہ تقدیر سفر طے کر رہا ہے۔ اچانک اس لحیم شحیم سے بھی زیادہ لحیم شحیم شخص راستہ روکتا ہے اور کہتا ہے کہ اب تم اس طرف جا رہے ہو تو میرے بچوں کے لئے تین چار من آم لیتے جاؤ۔ مگر دیکھو ٹٹو بہت کمزور ہے تم تین چار من کا ٹوکرا اس پر لادو گے تو کہیں یہ بیچ میں سے ٹوٹ کر ہی نہ رہ جائے اس لئے ایک اور تکلیف کرو۔ یہ ٹوکرا اپنے سر پر رکھ لو۔ تم ماشاء اللہ خاصے پلے ہوئے ہو اور ٹٹو یہ بوجھ اٹھانے کے قطعی قابل نہیں ہے! اب یہ صاحب اس بھاری ٹوکرے کو سوار کے سر پر رکھ دیتے ہیں اور خوش ہیں کہ ٹٹو محفوظ رہا۔ حالانکہ چار من کے سوار کے علاوہ چار من کے ٹوکرے کا بوجھ بھی ٹٹو ہی کو اٹھانا ہے۔ اپنے حساب سے اس شخص نے نہایت "متوازن بجٹ" بنایا مگر ٹٹو کی پسلیوں سے پٹاخے چھڑوا دیئے۔

پنجاب کا بجٹ مسٹر حنیف رامے بنا رہے ہیں۔ آپ مصور بھی ہیں' ادیب بھی ہیں' اخبار نویس بھی ہیں' عالم بھی ہیں' مقرر بھی ہیں' سیاسی لیڈر بھی ہیں۔ ان کی شخصیت میں صرف بجٹ سازی کی کمی رہ گئی تھی جو اسی مہینے میں پوری ہو جائے گی۔

مگر ان کی خدمت میں ایک گزارش ہے۔ ہمیں خدشہ ہے کہ کہیں وہ پنجاب کا بجٹ اسی طرح کا نہ بنا دیں جس طرح کسی زمانے میں وہ تصویریں بناتے تھے کہ ان کے موضوع کی آنکھیں گالوں میں ہوتی تھیں اور ناک ناف پر نصب ہوتی تھی۔ انہی کی بنائی ہوئی ایک پورٹریٹ کو دیکھ کر ایک شخص نے کہا تھا کہ سبحان اللہ' کیسا خوبصورت مکان تیار ہوا ہے! اگر انہوں نے بجٹ بھی تجریدی انداز کا بنا ڈالا تو بڑی مشکل پیش آئے گی کہ لوگوں کو سمجھنے میں بہت دقت ہوگی اور بے سمجھی میں لٹ جانا بڑا درد ناک ہوتا ہے۔

استدعا یہ ہے کہ بجٹ کا ناک نقشہ بالکل درست ہو اور انسانی اناٹومی کے عین مطابق ہو۔ یہ نہ ہو کہ بجٹ کے ہاتھ پر عوام کا سر رکھا ہو اور عوام کے ہاتھ میں بجٹ کا دامن ہو۔ یوں بھی نہ ہو کہ عوام بھی بجٹ کے حوالے سے اپنے معیار زندگی کی بلندی ناپ رہے ہوں کہ بڑھے ہوئے ٹیکس اور چڑھے ہوئے نرخ ان کی گردن ناپنے لگیں۔ ایسا بھی نہ ہو کہ بظاہر تو ٹیکس خواص پر لگائے جائیں مگر خود بجٹ سازوں کو بھی علم نہ ہو کہ خواص یہ ٹیکس عوام ہی کو کولہو میں ڈال کر کشید فرمائیں۔

وما علینا الا البلاغ

(۱۹۷۲ء)

ہندوستان اور اچانک حملہ

آج کل ہندوستان کی لوک سبھا میں پاکستان پر بہت توجہ صرف کی جارہی ہے۔ دراصل اب تو غیر ملکی مبصرین ہندوستان کے اندرونی حالات کا اندازہ اس امر سے لگاتے ہیں کہ وہاں کی لوک سبھا میں پاکستان کا ذکر کتنی بار آیا ہے۔ اگر بار بار آیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے اندرونی حالات بہت خراب ہو رہے ہیں اور وہاں کی حکومت' پاکستان کی طرف سے خطرات کا ذکر کرکے عوام کو ان کے اندر سے باہر نکالنا چاہتی ہے اور ان کی توجہ ہٹانا چاہتی ہے۔ ویسے عالمی مبصرین کا یہ اندازہ کچھ ایسا غلط نہیں ہے۔ دیکھ لیجئے کہ جب بھی ہندوستان میں بھوکوں کے جلوس نکلنے لگتے ہیں اور ہڑتالیں ہوتی ہیں اور اناج کے گودام لوٹے جاتے ہیں' انہی تاریخوں میں ہندوستان کے لیڈر پاکستان کے خلاف غیر معمولی بلاغت سے کام لیتے پائے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب سابق وزیر خارجہ' حال وزیر دفاع مسٹر سورن سنگھ اور سابق وزیر دفاع' حال وزیر داخلہ مسٹر چوان لوک سبھا میں پاکستان پر برسے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے اندر بہت شدید گڑبڑ ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ واقعی بہت شدید گڑبڑ ہے۔

لوک سبھا میں جن سنگھ کے ایک نمائندے پرکاش ویر شاستری ہیں۔ اگرچہ ان شاستری صاحب کا نام لال بہادر شاستری کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے' مگر یہ دوسرے

شاستری ہیں۔ انہوں نے لوک سبھا میں ایک تحریک پیش کی جس پر تقریر کرتے ہوئے مسٹر سورن سنگھ نے انہیں یقین دلایا کہ پاکستان اور چین کی سرحدوں پر متعین فوجوں کو بہت چوکس رکھا جارہا ہے "تاکہ دشمن اچانک حملہ نہ کردے!" ـــــ اس "اچانک حملے" کا پس منظر یہ ہے کہ اگر اس قسم کے حملوں کا ذکر تاریخ کی پرانی کتابوں میں آیا ہے اور ترقی یافتہ بیسویں صدی میں اس قسم کا حملہ انتہا درجے کی بد اخلاقی اور بد تہذیبی میں شمار ہوتا ہے' مگر ہندوستان قوت و اقتدار کے معاملے میں فی الحال چودہ پندرہ صدیاں پہلے کے دور میں سے گزر رہا ہے۔ اس لئے وہ اچانک حملے سے نہ صرف ہراساں رہتا ہے' بلکہ اچانک حملہ کرنے کا تجربہ بھی کرچکا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تجربہ کرکے بھگت بھی چکا ہے۔

اس وقت دنیا میں اچانک حملے کے صرف دو عالمی چمپئین موجود ہیں۔ ایک ہندوستان اور دوسرا اسرائیل۔ مگر اسرائیل ایک تو ہندوستان کی سرحدوں سے بہت دور ہے' اور پھر اسرائیل کے ساتھ تو ہندوستان کی بہت گاڑھی چھن رہی ہے' اس لئے اسرائیل سے تو اسے کوئی خطرہ نہیں ہے مگر بہرحال اسے اچانک حملے کا خطرہ تو ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسے خود اپنے آپ سے خطرہ ہے کہ کہیں وہ کسی پر اچانک حملہ نہ کر بیٹھے۔ خود لال بہادر شاستری نے پاکستان پر اچانک حملے کا یہ جواز پیش کیا تھا کہ ہمیں خطرہ تھا کہ کہیں پاکستان ہم پر اچانک حملہ نہ کردے اس لئے ہم نے اس پر اچانک حملہ کردیا۔ بہرحال یہ ہے سبب اس اچانک حملے کے خطرے کا' جس کا اظہار ہندوستان کے وزیر خارجہ نے اپنی تقریر میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ دشمن ملکوں کی سرحدوں پر ہندوستانی فوج چوکس کھڑی ہے۔ یوں سردار صاحب نے بھولپن میں یہ راز فاش کردیا ہے کہ ہندوستان کے پڑوسیوں پر کسی وقت بھی اچانک حملہ کیا جاسکتا ہے تاکہ ان کو اچانک حملے کا موقع نہ مل سکے!

مسٹر سورن سنگھ نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم نے اپنی طرف سے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ پاکستان کے ساتھ ہمارے تعلقات سدھر جائیں مگر پاکستانی لیڈروں نے

ہندوستان کے خلاف ہمیشہ بہت کڑا رویہ اختیار کئے رکھا اور ہندوستان کی طرف سے خیر سگالی کے جذبات کو ٹھکرا دیا۔ ہم سورن سنگھ صاحب سے متفق ہیں کہ ہندوستان نے خیر سگالی کا ماحول پیدا کرنے میں واقعی کوئی کمی نہ کی۔ مثال کے طور پر ہندوستان کی اس پیش کش کو پیش کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کشمیر کے موضوع پر بھی پاکستان سے گفت و شنید کرنے کو تیار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ گفت و شنید صرف اس موضوع پر ہو سکتی ہے کہ اس موضوع پر کوئی گفت و شنید نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ پاکستانی لیڈر اس معیار کی خیر سگالی کو ٹھکرا دیتے ہیں کیونکہ اس خیر سگالی میں "کتابت" کی غلطی ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کی یہ خیر سگالی دراصل "غیر سگالی" ہے!

ہندوستانی وزیر دفاع نے پاکستان کی طرف چین کے ساتھ بھی جذبات خیر سگالی کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے چین کو آگاہ کیا ہے کہ تم ۱۹۶۲ء میں ہندوستان پر حملہ کر چکے ہو مگر ۱۹۶۸ء کے ہندوستان اور ۱۹۶۲ء کے ہندوستان میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو چکا ہے اور تم نے ہندوستان پر حملہ کیا تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یعنی وزیر دفاع نے اعتراف کیا ہے کہ ۱۹۶۲ء میں خمیازہ ہندوستان ہی کو بھگتنا پڑا۔ یہ اعتراف حقیقت کا بالواسطہ اظہار ہے۔ جب کوئی کہے کہ آج تو جو ہوا سو ہوا مگر کل میں تمہاری خوب خبر لوں گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آج تم نے میری خوب خبر لی! پھر سورن سنگھ نے یہ وضاحت بھی نہیں کی کہ یہ جو ۶۸ء اور ۶۲ء مین زمین اور آسمان کا فرق پیدا ہو چکا ہے تو انہوں نے زمین کس سال کو قرار دیا ہے اور آسمان کس سال کو۔ یہاں ہمیں ایک امریکی کا لطیفہ یاد آگیا کہ جب اس سے کسی دوست نے پوچھا کہ شادی کا تم پر کیا اثر ہوا تو وہ بولا "شادی کے بعد میں لکھ پتی ہو گیا۔" دوست نے کہا "بڑی خوشی کی بات ہے مگر شادی سے پہلے تم کیا تھے؟" امریکی بولا: "شادی سے پہلے میں کروڑ پتی تھا!"

(۱۹۶۸ء)

تصور پاکستان

ابھی تک ہم لوگ یہی طے نہیں کر پائے کہ پاکستان کا تصور سب سے پہلے کس نے پیش کیا تھا۔ اس سلسلے میں ہماری معلومات واجبی سی ہیں' اس لئے ہمیں تو صرف اتنا علم ہے کہ علامہ اقبال نے پاکستان کا تصور پیش کیا۔ قائداعظم نے اس تصور کو عملی صورت دی اور یحییٰ خاں نے اس کی صورت بگاڑی۔ مگر محققین کے جوش جستجو کے سامنے آخر کس نے بند باندھا ہے۔ چنانچہ انکشافات پر انکشافات ہوتے رہتے ہیں اور پاکستان کا تصور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ اب کراچی میں ایک تازہ انکشاف کے مطابق وہ بیسویں صدی سے نکل کر انیسویں صدی میں منتقل ہو گیا ہے۔

دراصل ہم بڑی دلچسپ قوم ہیں اور تحقیق تو جیسے ہماری گھٹی میں پڑی ہے۔ ہم ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ تحریک پاکستان کے دنوں میں لاہور کی سیکرٹریٹ پر مسلم لیگ کا جھنڈا کس لڑکی نے گاڑا تھا۔ اس واقعے کے متعدد چشم دید گواہ موجود ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ ہر گواہ نے الگ لڑکی دیکھی۔ اس سلسلے میں چند برس پہلے اخبارات میں بہت ہنگامہ رہا اور آخر طے پایا کہ جھنڈا اسی لڑکی نے گاڑا' جس نے گاڑا تھا اور جنہوں نے نہیں گاڑا' انہوں نے نہیں گاڑا۔ دراصل تحقیق علم ہی ایسا ہے کہ اس پر ہر وقت گومگو کی حالت طاری رہتی ہے۔ ہمارے ادبی محققین تو ابھی تک یہی طے نہیں کر سکے کہ مرزا غالب مسور کی دال پسند کرتے تھے یا مونگ کی۔ محققین فی الحال اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ بظاہر انہیں مسور کی دال پسند تھی مگر قرائن بتاتے ہیں کہ مونگ کی دال

پسند تھی۔

جب چودھری خلیق الزمان نے اپنی تصنیف لطیف بزبان انگریزی شائع کی تو تصور پاکستان اور قیام پاکستان سے متعلق مروجہ مفروضوں کو بڑا جھٹکا لگا۔ لوگ شبے میں پڑ گئے اور سچ کہا ہے کسی نے کہ جب انسان شبے میں پڑتا ہے تو دراصل اپنے محقق بننے کا آغاز کر رہا ہوتا ہے۔ سو محققین پیچھے کی طرف دوڑے اور تصور پاکستان کے سلسلے میں نصف صدی عبور کر کے ۱۹۰۱ء تک جا پہنچے۔ مگر تحقیق کے افق بہت وسیع ہیں۔ حال ہی میں کسی صاحب نے تحقیق کی ہے کہ میکسیکو کے باشندے دراصل ان عرب جہاز رانوں کی اولاد ہیں جو کولمبس سے صدیوں پہلے "نئی دنیا" میں پہنچے اور اسے پرانی دنیا میں بدل کر واپس آ گئے۔

تازہ انکشاف ۱۳ اگست کو پاکستان ایران کلچرل ایسوسی ایشن کراچی کے اجلاس میں ریٹائرڈ سی۔ ایس۔ پی افسر جناب سید ہاشم رضا نے کیا ہے۔ آپ نے بتایا ہے کہ برصغیر کو تقسیم کرنے کی تجویز سب سے پہلے معروف ناول نگار مولانا عبدالحلیم شرر نے ۱۸۹۰ء میں پیش کی تھی، جس طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ علامہ اقبال نے شاہین کا تصور خوشحال خاں خٹک سے لیا ہے اور مرد مومن کا تصور نیٹشے سے لیا ہے اور خودی کا تصور مولانا رومی سے لیا ہے، اسی طرح اب یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے پاکستان کا تصور مولانا عبدالحلیم شرر سے لیا ہے۔ یہ تحقیق جاری رہنی چاہئے تاکہ علامہ اقبال کا سارا کلام اور فلسفہ دوسروں کو منتقل ہو جائے اور ان کے پاس صرف بچوں کی نظمیں رہ جائیں۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

سید ہاشم رضا تو مولانا عبدالحلیم شرر کا نام تجویز فرما کر الگ ہو گئے مگر یوں سمجھئے کہ اب محققین کی بن آئی ہے۔ اب یہ تحقیق شروع ہو گی کہ مولانا شرر نے برصغیر کی تقسیم کا تصور کہاں سے لیا۔ کہیں مرزا غالب سے تو نہیں لیا۔ جس نے کہا تھا کہ:

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

اور کہیں مرزا غالب نے یہ تصور میر سے تو نہیں لیا جس نے کہا تھا کہ

دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور کہیں میر نے یہ تصور محمد تغلق سے تو نہیں لیا تھا جس نے دارالحکومت کو دلی سے دولت آباد منتقل کر دیا تھا اور کہیں محمد تغلق نے یہ تصور ___ غرض تحقیق کی کوئی حد مقرر نہیں۔

وہ جو بعض ہندو محققین نے دعوی کیا ہے کہ قطب مینار دراصل اشوک کی لاٹھ ہے اور تاج محل دراصل ایک مندر ہے اور سویڈن دراصل سوئی دان ہے جس پر ہندو حکمران رہ چکے ہیں اور وہاں سوئی دان کی تحریک چلا چکے ہیں، تو ہم سمجھتے تھے کہ ہندو محققین کا ریکارڈ توڑنا کارے دارد ہے۔ مگر اب ماشاء اللہ ہمارے ہاں بھی تحقیق کچھ ایسی ہی ڈگر پر چل نکلی ہے ___ اور ابھی چند روز پہلے کی بات ہے کہ ہمارے ایک محقق دوست نے یہ ثابت کرنے کا ذمہ لیا کہ مصر کا ایک بادشاہ لاہور کے ایک علاقے میں دفن ہے اور اسی لئے اس علاقے کو مصری شاہ کہتے ہیں۔

(۱۹۷۲ء)

ایک منجمد مشاعرہ

پچھلے دنوں ایک بے حد مہذب، بے حد مودب اور بے حد منجمد مشاعرہ سننے کا اتفاق ہوا۔ شاعر لوگ اپنی آہوں سے زمین و آسمان کو تو آگ لگا سکتے ہیں مگر افسوس کہ اس مشاعرے کے حاضرین کو نہ گرما سکے۔ شاعر کے منہ سے شعر شعلے بن کر نکلتے تھے مگر اولے بن کر گرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پوری مشاعرہ گاہ ریفریجریٹر میں بند پڑی ہے۔ ٹھٹھرا ہوا شاعر مائیکروفون کے سامنے آکر لمحہ بھر کو تو یوں کھڑا رہ جاتا تھا جیسے یخ بستہ جبڑے کو کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر جب وہ کپکپاتی آواز میں شعر پڑھتا تھا تو سامعین یوں حیران ہو کر اسے دیکھتے تھے جیسے سوچ رہے ہیں کہ یہ بے چارہ کیا کر رہا ہے اور کس جرم کی سزا بھگت رہا ہے۔

یہ مشاعرہ ایک رفاہی ادارے کی طرف سے منعقد ہوا۔ لاہور کے شعراء جب مشاعرہ گاہ کا پتہ پوچھتے ہوئے پہنچے تو انہیں ایک عمارت تک پہنچایا گیا جو رنگ رنگ کے بلبوں سے سج رہی تھی اور اس کی پیشانی پر "ہسپتال" کا بورڈ آویزاں تھا۔ پھر ان شاعروں کو کھانا کھلانے کے لئے ذیل گھر لے جایا گیا اور ہسپتال سے ذیل گھر تک انہیں ہسپتال کی "ایمبولینس" میں سفر کرنا پڑا۔ ایمبولینس میں شاعروں کے سفر اور ہسپتال میں مشاعرے کے انعقاد ہی نے اس امر کی نشاندہی کر دی تھی کہ سامعین مریضوں پر مشتمل ہوں گے اور اگرچہ سامعین بظاہر سرخ و سفید تھے مگر ان کے

جسموں کے علاوہ ان کے ذہنوں کو بھی سردی لگی ہوئی تھی اور وہ شعریوں سنتے تھے جیسے آپریشن کے انتظار میں پڑے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے سٹیج سیکرٹری کو بھی سردی لگی ہوئی تھی کیونکہ جب انہوں نے کمشنر کو "کرسی صدارت" پر تشریف رکھنے کو کہا تو یہ دیکھنا بھول گئے کہ صدر کے لئے کرسی کی بجائے تخت بچھایا گیا ہے۔ سو وہ کرسی صدارت کی بجائے تخت صدارت زیادہ سے زیادہ مسند صدارت پر بیٹھے اور مشاعرے کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ ایک سوٹڈ بوٹڈ حافظ صاحب چند آیات کی قرات کرنے کے بعد واپس جا رہے تھے تو حاضرین میں سے کسی صاحب نے حیران ہو کر کہا۔ "ارے! حافظ صاحب نے تو ٹیڈی پتلون پہن رکھی ہے!" ہم نے یہ چنگاری دیکھ کر سوچا کہ مشاعرے کے انجماد کے سلسلے میں ہمارا خوف محض ہمارا وہم ہے اور مشاعرہ آہستہ آہستہ گرم ہو جائے گا مگر آہستہ آہستہ پورے مشاعرے کے دانت بجنے لگے اور جب مشاعرہ ختم ہوا تو لوگ یوں اٹھ کر بھاگے جیسے باہر انگیٹھیاں تپ رہی ہیں۔

جب مشاعرہ بالکل برف ہو کر رہ گیا تو منتظمین مشاعرہ میں سے ایک صاحب نے ایک شاعر کی طرف جھک کر پوچھا' "کیوں جی' کوئی "مخولی" شاعر نہیں آیا؟" شاعر نے شعراء کے اس طبقے کا یہ نام اب تک نہیں سنا تھا۔ پوچھا "مخولی شاعر سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" منتظم نے کہا۔ "یہی مسخرے شاعر!" شاعر نے اپنی برادری کے ان افراد کی مدافعت کرتے ہوئے کہا۔ "ہم انہیں مزاحیہ شاعر کہتے ہیں"۔ منتظم نے وضاحت کی "آپ جو بھی کہتے ہوں مگر میں آپ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا کوئی ہنسانے والا شاعر نہیں آیا؟" شاعر نے جواب دیا۔ "جی فی الحال تو مجھے ایسا کوئی شاعر نظر نہیں آرہا ہے لیکن آپ مطمئن رہیئے کہ آج کل بعض سنجیدہ شاعر بھی ایسے شعر کہہ جاتے ہیں کہ سنتے ہی بے اختیار ہنسی آجاتی ہے"۔

سٹیج سیکرٹری خود بھی شاعر تھے۔ ان کی باری آئی تو انہوں نے یہ سوچ کر کہ آخر وہ اتنے عرصے سے بسلسلہ ملازمت اس شہر میں مقیم ہیں تو وہاں کے لوگ انہیں

جانتے ہی ہوں گے۔ حاضرین سے کہا۔ "مجھے تو آپ لوگ جانتے ہی ہوں گے" اور حاضرین نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔ "نہیں جانتے"۔ اس پر ہمیں خود ہم یاد آگئے۔ ایک دوست نے ایک بڑے افسر سے ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا۔ "امید ہے آپ نے ان کے اشعار اور افسانے پڑھے ہوں گے"۔ اور افسر نے ارشاد فرمایا تھا۔ "جی کبھی اتفاق نہیں ہوا۔" پھر ہمیں حضرت حفیظ جالندھری یاد آگئے جن کا تعارف جالندھر کے ایک مشہور کاروباری سے کرایا گیا تھا تو اس نے مصافحے کے لئے حفیظ صاحب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ خوب خوب۔ تو آپ بھی جالندھر کے رہنے والے ہیں!"

بہرحال باہمت ہیں وہ لوگ جو اتنی شدید سردی میں بھی مشاعرے منعقد کرا لیتے ہیں اور مشاعرے جیسی چیز سننے کے لئے اتنے بڑے بڑے افسروں کو بھی جمع کر لیتے ہیں اور فضا کی برودت کو کم کرنے کے لئے پان چائے اور کشمش بادام کا انتظام بھی فرماتے ہیں اور جب بڑے بڑے حکام کی مدارات کے بعد کی بچی ہوئی چائے شاعروں کو ملتی ہے تو وہ چپکے سے اسے پی لیتے ہیں اور جب کشمش بادام کی پلیٹوں کی باقیات ان کے سامنے لائی جاتی ہیں تو وہ ایک ایک بادام کے چار چار ٹکڑے کر کے اور ان ٹکڑوں کو آپس میں بانٹ کر یہ سوچ کے اپنی ڈھارس بندھا لیتے ہیں کہ ہم نے بادام کھائے ہیں اور جب پانوں کا طشت حکام کے سامنے سے گھوم پھر کر شاعروں کے سامنے آتا ہے اور اس میں الائچی کے دو چھلکے سپاری کے چار ٹکڑے اور ایک لونگ رکھی ہوتی ہے تو ایک شاعر صاحب لونگ کو منہ میں رکھ کر اعلان کرتے ہیں کہ یاد رکھو دوستو' مشہور شرپاتن سنگ نے صرف ایک لونگ منہ میں رکھ کر ایورسٹ کو سر کر لیا تھا۔

(۱۹۶۴ء)

علی پور کا یادگاہ مشاعرہ

حکومت پنجاب نے ایک بار' فروری کے تیسرے ہفتے سے قومی "میلہ اسپاں و مویشیاں" کے ساتھ صنعتی نمائش لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر حیرت ہے کہ کل پاکستان مشاعرہ منعقد کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ مشاعرہ لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ جہاں دن کو مویشیوں کا میلہ لگا ہو گا' وہاں شام کو مشاعرہ ضرور ہو گا۔ اور جہاں شام کو مشاعرہ ہو گا' وہاں دن کو گائے بھینسوں کا کھوے سے کھوا چھلنے لگے گا۔

بر سبیل تذکرہ ہمیں علی پور (ضلع مظفر گڑھ) کا ایک پاک و ہند مشاعرہ یاد آگیا کہ اس میں پاکستان کے بڑے شعراء کے علاوہ ہندوستان کے حضرت جگر مراد آبادی بھی شامل تھے۔ اس سب ڈویژن کے افسر اعلیٰ خوش ذوق بزرگ تھے چنانچہ جب وہاں سالانہ میلہ اسپاں و مویشیاں منعقد کرنے کا اہتمام ہوا تو انہوں نے ایک دنگل منعقد کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا اور یہ بھی طے کر لیا کہ ایک عظیم الشان مشاعرہ بھی ہو گا۔

جب شعراء علی پور پہنچے تو انہوں نے وہاں کی دیواروں پر "میلہ اسپاں مویشیاں و دنگل و مشاعرہ" کی سرخی والے پوسٹر بھی چسپاں دیکھے' جن میں پہلوانوں اور شاعروں کے ناموں کو آپس میں یوں مدغم کر دیا گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا بھولو پہلوان غزل سنائیں گے اور فیض احمد فیض کشتی لڑیں گے۔ شعراء کو علی پور کے قریب "پنجند" کے مقام پر' جہاں پنجاب کے پانچوں دریا مل کر بہنے لگتے ہیں' ڈاک بنگلے میں

ٹھہرایا گیا اور پر تکلف کھانے کے بعد انہیں مشاعرہ گاہ پہنچایا گیا۔

شعراء کو وسیع اسٹیج پر بٹھایا جا رہا تھا' سو ہم بھی اسٹیج پر جا کر بیٹھے اور حاضرین پر نگاہ ڈالی تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ علی پور میں شاعری کے سینکڑوں پرستار کہاں سے آگئے اور حد نظر تک بیٹھے ہوئے ان لوگوں کے دائیں بائیں آگے پیچھے یہ لاٹھیوں کا جنگل سا کیسا لگ رہا ہے۔ جدھر بھی نگاہ جاتی تھی' مشاعرے کے شائقین نظر آتے تھے یا سیدھی کھڑی ہوئی لاٹھیاں۔ بعض شعراء تو مشاعرے اور لاٹھی کے رشتے پر غور کرتے ہوئے اس "نتیجے" تک بھی پہنچے کہ ممکن ہے یہاں قاعدہ رائج ہو کہ شعر پسند آئے تو شاعر کو داد دو اور پسند نہ آئے تو شاعر پر لاٹھیاں برساؤ۔

خدا خدا کر کے راز کھلا کہ اس ساری مخلوق کو تھانیدار اپنے اپنے علاقوں سے بیگار پر ہانک کر لے آئے ہیں۔ گرمیوں کا موسم ہے اس لئے سانپ بچھو کا خطرہ رہتا ہے۔ ویسے بھی کسان لوگوں نے بہت سے دشمن پال رکھے ہوتے ہیں چنانچہ ان کے ہاتھ میں لاٹھی کی موجودگی ضروری ہے۔ اب پولیس کی جمع کی ہوئی یہ مخلوق اپنی لاٹھیوں کو زمین پر سیدھا لٹا نہیں سکتی کیوں کہ آگے پیچھے لوگ بیٹھے ہیں۔ اور لاٹھی کو لٹانے کی جگہ نہیں ہے' چنانچہ سب نے لاٹھیوں کو کھڑا کر رکھا تھا۔ اور اسی لئے لاٹھیوں کا یہ جنگل اگ رہا ہے۔

مشاعرہ شروع ہوا تو سینکڑوں سامعین کرام میں سے کوئی ایک بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ بڑے بڑے جغادری شعراء "شعر عرض کیا ہے" اور "شاید کسی قابل ہو" کی دعوتیں دیتے رہے مگر!

واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں ـــــ اس مہر خاموشی کو ایک شاعرہ نے توڑا۔ شاعرہ کا ترنم بلا کا کرارا تھا' چنانچہ جب وہ پہلا یا دوسرا شعر پڑھ چکیں تو سامعین کرام میں سے کسی کی آواز آئی بی بی! اللہ تیں کوں حج کراوے!" اور یوں سمجھئے کہ یہ بی بی ہی مشاعرہ لوٹ لے گئی۔ باقی سب شعراء حاضرین کی خاموشی کو نہ توڑ سکے اور جب مشاعرہ ختم ہوا تو شعراء یوں خوش ہوئے جیسے ابھی ابھی قید بامشقت

سے رہا ہوئے ہیں۔

(۱۹۸۳ء)

کتابت کی غلطیاں

بورے والا سے جناب محمد حفیظ کھوکھر نے ہمیں "امروز" کی ۲۵ اور ۲۶ فروری کی اشاعتوں جھٹکا لگا کے بعض تراشے بھیجے ہیں۔ ان میں کتابت کی ایسی غلطیاں ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور دل شکن بھی مثلاً ایک اشتہار میں "دس یاؤنڈ کے ایک ڈبہ یا ۵ پاؤنڈ کے دو ڈبوں" کی جگہ ___ "دس پاؤنڈ کے ایک ڈبہ پا ۵ یاؤنڈ" کے الفاظ درج ہیں۔ یہ "پا ۵ یاؤنڈ" دراصل "یا ۵ پاؤنڈ" ہیں مگر شکر کیجئے کہ معاملہ پا اور یاؤنڈ پر ہی ختم ہو گیا ورنہ "دو پاؤنڈ کے پانچ ڈبوں" کو "پو داؤنڈ کے ڈانچ پبوں" بھی تو لکھا جا سکتا تھا۔ اس صورت میں "پا ۵ یاؤنڈ" کتابت کی خاصی قابل برداشت غلطی ہے۔

دوسری غلطی تو بے حد مزے کی ہے بلکہ اتنی مزے کی ہے کہ اس کا ایک رنگ نکل آیا ہے۔ خبر صرف اتنی سی ہے کہ درآمد برآمد کے چیف کنٹرولر نے اعلان کیا ہے کہ موجودہ درآمدی مدت (جنوری تا جون) کے دوران محدود مقدار میں مصنوعی یارن درآمد کیا جائے گا ___ مگر اس خبر کی سرخی میں یہ مصنوعی یارن باقاعدہ سرخ ہو گیا ہے۔ سرخی یہ ہے:

محدود مقدار میں مصنوعی پان درآمد کرنے کا فیصلہ

کھوکھر صاحب نے یہ سرخی پڑھ کر نہ جانے کیا تاثر لیا مگر ہم یہ سمجھے کہ اس زمانے میں جب کہ نائیلون کے آدمی تک بن رہے ہیں ممکن ہے، نائیلوں کے پان بھی تیار ہونے لگے ہوں۔ پاکستان میں پانوں کی قلت ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے حکومت نے عوام کی سہولت کے لئے مصنوعی پان تیار کرنے والی کسی کمپنی کا کھوج لگایا ہو اور چیف

کنٹرولر نے انہی پانوں کی لائسنسنگ کے قواعد کا اعلان کیا ہو۔ بعد میں جب خبر کے متن میں پان کی بجائے یارن نکلا تو سچی بات ہے، ہمیں تو سخت کوفت ہوئی۔

آخری خبر مشرقی افریقہ سے برطانیہ آنے والے ایشیائی تارکین وطن کے بارے میں ہے۔ متن میں ایک جگہ لکھا ہے:۔

اب برطانیہ کے اس نئے قانون سے ایشیائی تارکین وطن کی تعداد ڈیڑھ ہزار سالانہ تک محدود کر دی جائے گی۔

مگر آگے چل کر اسی خبر میں یہ عبارت درج ہے:

ائرلائنز کے افسروں کا خیال ہے کہ برطانیہ نے تارکین وطن کا سالانہ ڈیڑھ کروڑ کا جو کوٹا تجویز کیا ہے۔

ڈیڑھ ہزار اور ڈیڑھ کروڑ میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ کا فرق سہی مگر یہ تو محض کتابت کی ایک غلطی ہے، ورنہ ہم نے تو ایک اخبار میں یوں بھی درج دیکھا ہے:

بھارت کے دفاعی بجٹ پر دس عرب خرچ ہوں گے۔

اس خبر میں "نیروبی کی ذیلی سرخی" کے نیچے کاتب نے لکھا اور پروف ریڈر نے پاس کیا اور بورے والا کے کھوکھر صاحب نے ہم سب کے سمیت پڑھا ہے کہ نئے برطانوی قانون کی پابندیوں سے متعلق:

ایشیائیوں میں دہشت ریز جوش بڑھ رہا ہے

کھوکھر صاحب پوچھتے ہیں کہ یہ "دہشت ریز جوش" کیا ہوتا ہے۔ اب ہم کیا عرض کریں کہ وہ بورے والے میں بیٹھے ہیں۔ وہ نیروبی میں ہوتے تو ان کے دل میں نہ صرف "دہشت ریز جوش" پیدا ہوتا بلکہ ممکن تھا کہ "پا ۵ یاؤنڈ" کے اصول کے مطابق یہ دہشت ریز جوش "دہشت جیز دوش" بن جاتا اور اگر نہ بنتا تو جوش کے آگے ملیح آبادی تو ضرور لگ جاتا۔ یہ ہم اس لئے عرض کر رہے ہیں کہ ابھی کچھ روز پہلے ایک شادی کی تقریب میں ایک میراثی نے دولھا کو دعا دی تھی کہ خدا آپ کا علامہ اقبال بلند کرے!

(۱۹۶۸ء)

تحقیق

یہ ریسرچ کا زمانہ ہے۔ اس صدی میں ایسی ایسی ریسرچیں منظرعام پر آئی ہیں کہ انسان خود کو سر کے بل کھڑا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ کسے معلوم تھا کہ ہوائی جہاز مہابھارت کے زمانے میں بھی موجود تھے۔ کون جانتا تھا کہ امریکہ کے ساحل پر کولمبس سے پہلے مصر کے چند تاجر اترے تھے۔ کس کو خبر تھی کہ ہندوستان میں واسکوڈی گاما سے پہلے ایک روسی سیاح آچکا تھا۔ یہ ریسرچیں تاریخ سے متعلق تھیں۔ لیکن بعض ریسرچیں تو خالص "تاریخی" نوعیت کی حامل ہیں۔ مثلاً" یہ ریسرچ کہ قطب مینار کو زمین پر لٹاکر تعمیر کیا گیا اور پھر اسے کھڑا کر دیا گیا' یا یہ کہ قطب مینار پرانے زمانے کا ایک کنواں تھا جسے قطب الدین ایبک کی فوجوں نے زمین کے اندر سے نکالا' سیدھا کیا اور زمین کے اوپر جمادیا' یا ریل کے انجن میں گھوڑے کاٹ کر ڈالے جاتے ہیں۔ اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں انجن میں اتنے گھوڑوں کی طاقت (ہارس پاور) ہے۔ اس ریسرچ اسکالر نے بتایا کہ موٹر کاروں میں پٹرول کے بجائے دراصل گھوڑوں کی یخنی استعمال ہوتی ہے۔

اب اگر کوئی صاحب اس قسم کی ریسرچ کرڈالیں کہ بجلی کا موجد ایڈیسن امریکہ کے بجائے لالہ موسے میں پیدا ہوا تھا اور سبی میں جاکر اس نے اپنی لیبارٹری قائم کی تھی اور وہ ٹنڈو آدم میں دفن ہوا' تو آپ کو یقین کرلینا چاہئے۔ کیونکہ اگر آپ یقین

نہیں کریں گے تو جاہل کہلائیں گے۔ یا اگر کوئی یہ کہے کہ گلیلیو دراصل گل محمد تھا اٹلی کے چند بحری قزاق کا ٹھیاواڑ کے ساحل سے اٹھالے گئے تھے تو آپ کو اعتراض کی ضرورت نہیں کیونکہ جس نے اعتراض کیا وہ راندۂ درگاہ ٹھہرا۔ کچھ اس قسم کی ایک ریسرچ ہمارے علم میں لائی گئی ہے' وہ یہ ہے کہ بجلی کی روشنی کا موجد ایڈیسن بھی ٹھیک کہتا تھا اور اردو کے بے شمار لطیفوں کا موجد شیخ چلی بھی غلط نہیں کہتا تھا۔ آپ بظاہر ایڈیسن اور شیخ چلی کے جوڑ پر ہنسیں گے لیکن اگر اس ریسرچ کی تفصیل میں جائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ریسرچ کرنے والا غلط نہیں کہہ رہا ہے۔

ایک دوست نے لکھا ہے کہ ان کے شہر کے ایک بزرگ نے تھیسس پیش بھی کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر شیخ چلی نے یہ سوچا تھا کہ وہ مزدوری کرے گا' اجرت سے انڈے خریدے گا' انڈوں سے مرغیاں نکالے گا' مرغیاں بیچ کر بکریاں خریدے گا' بکریاں بیچ کر گائے' بھینسیں خریدے گا اور یوں امیر آدمی ہو جائے گا تو اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ کیونکہ بالکل اسی طرح ایڈیسن نے اپنے غریب و نادار دوست ہنری فورڈ اول کو مشورہ دیا تھا کہ "تمہارے دماغ کو کوئی نہیں پکڑ سکتا' اس لئے بڑے سے بڑا منصوبہ تیار کرو۔" کمی یہ رہ گئی کہ شیخ چلی اپنے شیشے کے برتنوں کے ٹوکرے کو لات مار بیٹھا' اور پھر ہمت ہار بیٹھا۔ لیکن ایڈیسن کے دوست فورڈ نے ٹوکروں کے الٹنے کے باوجود ہمت نہ ہاری اور دنیا کا امیر ترین آدمی بن گیا۔ اس ریسرچ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر شیخ چلی میں بھی ہنری فورڈ کی سی ہمت اور استقامت ہوتی اور وہ اپنی سکیم پر عمل پیرا رہتا تو آج اس کا خاندان ایشیا کا فورڈ خاندان ہوتا اور لوگ شیخ چلی فیملی کا رکن کہلانے پر فخر کرتے۔

اس ریسرچ میں اگر یہ "اگر" اٹکا نہ رہ جاتا تو ریسرچ ہر لحاظ سے مکمل تھی' کیونکہ یہ ایسا ویسا "اگر" نہیں ہے۔ بڑا خوفناک "اگر" ہے۔ اگر ابراہیم لودھی بابر کو شکست دے دیتا تو ہندوستان میں مغلوں کی حکومت کیسے قائم ہوتی یا اگر یورپی ملکوں

کی تجارتی کمپنیوں میں سے انگریزوں کی کمپنی کے بجائے فرانس کی کمپنی کامیاب رہتی تو آج ہماری سرکاری زبان فرانسیسی ہوتی یعنی یہ "اگر" خاصا پرابلم ہے اور اس "اگر" کا سہارا لے کر شیخ چلی اور ایڈیسن کو ایک سطح پر لے آنا ایک اور پرابلم ہے۔

سنا ہے' اس "اگر" کی ایک مثال انہی ریسرچ سکالر صاحب نے دے دی ہے۔ انہوں نے گلیلیو کا واقعہ لکھتے ہوئے کہا ہے کہ جب پادریوں نے یہ کہا کہ زمین کا گھومنا ان کی مذہبی تعلیم کے خلاف ہے تو گلیلیو کو موت کا حکم سنا دیا گیا۔ پھر بھی وہ اپنے اس دعوے سے تائب نہ ہوا۔ ایک پادری نے گلیلو سے کہا کہ "اگر" تم اب بھی کہہ دو کہ زمین ساکن ہے تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ اس پر گلیلیو نے متذکرہ خوفناک "اگر" کو اپنے انداز میں استعمال کیا "بولا" اگر میں یہ کہہ بھی دوں کہ زمین ساکن ہے تو جب بھی زمین تو گھومتی ہی رہے گی!"

چند تحقیقیں

ہم نے جب تک تاریخ کو تاریخ کی حیثیت میں پڑھا' خاصی تشنگی محسوس ہوتی رہی' مگر جب ایک روز کسی محقق قسم کے مورخ کا اس قسم کا مضمون پڑھا کہ محمد تغلق صرف پرائمری پاس تھا اور علاؤالدین خلجی منہ سے بڑے غضب کی سیٹی بجاتا تھا' تو ہمیں بھی تحقیق کا شوق چرایا۔ ہم نے تاریخ کی ہر شخصیت اور ہر واقعے کی خوب چھان تحقیق کی اور ثابت کیا کہ "واسکوڈی گاما" دراصل بھائی دروازے کا غلام محمد عرف "گاما" تھا جو "واسکٹ" پہنتا تھا اور "کوڈی" (کبڈی) بہت اچھی کھیلتا تھا۔ اسی طرح ہم نے یہ بھی ثابت کیا کہ شیکسپئر دراصل مسمی شیخ پیر تھا جو ضلع گجرات کے مقام ڈنگہ کا باشندہ تھا اور چین کے آنجہانی وزیراعظم مسٹر چو این لائی تو صاف ستھرے چودھری نور الٰہی تھے۔

یہ ہماری اسی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے کہ ہمیں تاریخ کی کسی شخصیت پر کوئی اعتبار نہیں رہا۔ مثلاً" ہماری تاریخ کہتی ہے کہ ظہیرالدین بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دی۔ مگر ہماری تحقیق کہتی ہے کہ لودھی شکست کھانے والی اسامی نہیں تھا۔ وہ بظاہر ہارا مگر دراصل جیتا اور وہ یوں کہ بھاگتے بھاگتے پلٹا اور مٹھی بھر مغلوں کو چرمر کر دیا۔ البتہ اس نے سوچا کہ عوام کی رائے میں تو ابراہیم لودھی مر چکا ہے اور اگر وہ اسی نام سے تخت پر بیٹھا تو لوگ چیخ مار کر بھاگ کھڑے ہوں گے کہ یہ تو لودھی کی روح

ہے۔ سو اس نے مغلوں کے رہنما بابر کا سر کاٹا۔ پھر اپنا سر کٹوایا' پھر بابر کا سر اپنی گردن پر فٹ کرالیا اور یوں تاریخ کے ایک عظیم ڈھکوسلے کا آغاز کیا۔

مگر افسوس کہ تاریخ کے سلسلے میں ہماری تمام تحقیقی سرگرمیاں اکارت گئیں اور بعض اخبارات میں ملکہ نور جہاں کے بارے میں اس بلا کی تحقیقوں (یا تحاقیق؟ جو بھی آپ پسند فرمائیں) کا انکشاف ہوا ہے کہ وہ جو ہم عنقریب ثابت کرنے والے تھے کہ لینن دراصل حصار کرنال کا جاٹ مسمی "لال دین" تھا اور برنارڈ شا "بڑا نادر شاہ" نامی ایک مجذوب تھا جو چیچو کی ملیاں سے برطانیہ کی طرف بھاگ گیا تھا۔ تو ہماری یہ تحقیقیں گرد ہو کر رہ گئیں۔ ملکہ نور جہاں کے بارے میں دو "تحاقیق" منظر عام پر لائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ جو ملکہ نور جہاں پر عطر گلاب کی ایجاد کی تہمت باندھی گئی ہے تو یہ سراسر غلط ہے اور یہ عطر تو ملکہ نور جہاں کی بجائے مادر نور جہاں نے ایجاد کیا تھا۔ یہاں تک بھی خیریت تھی' مگر دوسری تحقیق نے تو ہماری سٹی گم کر دی ہے اور وہ تحقیق یہ ہے کہ مقبرہ نور جہاں میں ملکہ نور جہاں دفن نہیں ہے۔

یہ تحقیق تو خاصی قرین قیاس ہے (حالانکہ تحقیق کو قرین قیاس نہیں ہونا چاہیے ورنہ اسے تحقیق کون کہے گا) کہ توزک جہانگیری کے مطابق عطر گلاب نور جہاں کی والدہ نے ایجاد کیا تھا اور جہانگیر نے خوش ہو کر اسے موتیوں کی ایک لڑی عنایت کی تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو مورخین گذشتہ صدی دو صدی سے ہمیں کڑک کڑک کر بتاتے رہے کہ عطر نور جہاں کی ایجاد ہے تو انہوں نے توزک جہانگیری پڑھنے کی تکلیف کیوں گوارا نہ فرمائی۔ بہر حال ہمیں افسوس ہے کہ ملکہ نور جہاں کے چہرے کے گرد ہم نے حسن و ذہانت کا جو ہالہ پیدا کر رکھا تھا' اس کا ایک حصہ اس تحقیق کے بعد تڑک سے ٹوٹ کر گر گیا ہے اور ہماری وہی کیفیت ہوئی ہے جو ایک شاعر کی ہوئی تھی۔ یہ شاعر چاند پر فدا تھا۔ اس کی شاعری کا آدھا حصہ چاند اور چاندنی سے عبارت تھا۔ پھر ایک روز اہل مغرب نے ایک مصنوعی سیارہ بھیج کر چاند کے سامنے

اور عقبی حصے کے فوٹو اتروائے اور انہیں ساری دنیا کے اخباروں میں چھپوا دیا۔ ان تصویروں میں چاند کی سطح یوں دکھائی دیتی تھی جیسے راکھ کے ڈھیر پر چند بوندیں گر گئی ہیں۔ اس چیچک زدہ سیارے کو قریب سے دیکھ کر یہ شاعر ہفتہ بھر تک روتا رہا اور اب جب بھی شعر کہتا ہے' مریخ و مشتری اور زہرہ و زحل کی باتیں کرتا ہے۔ مجال ہے جو بے چارے چاند کی رسید بھی دے جائے۔

اور اب اطلاع آئی ہے کہ ملکہ نور جہاں اور شیر افگن سے اس کی بیٹی لاڈلی بیگم (مگر کیا لاڈلی کا لفظ ان دنوں قلعہ معلی میں رائج ہو چکا تھا؟) کی لاشیں "مقبرہ نور جہاں"؟ کے تہ خانے میں سونے کی زنجیروں کے ساتھ قیمتی صندوقوں میں معلق تھیں' مگر سکھوں نے جب مغل مقبروں کی لوٹ مار کی تو یہ زنجیریں بھی کاٹ لیں اور صندوق بھی باہر گھسیٹ لائے اور انہیں کھولا تو اندر سے خزانے کی بجائے لاشیں برآمد ہوئیں' سو انہوں نے لاشیں نکال کر باہر پھینکیں اور صندوق اٹھا کر لے گئے۔ بعد میں ان لاشوں کو لوگوں نے مقبرے کے گرد و نواح یا شاہی قلعہ میں کہیں دفن کر دیا' مگر کہاں دفن کیا؟ اس راز سے پنجہ آزما ہونے کے لئے آثار قدیمہ کے ماہرین کی ایک جماعت عنقریب کچھ کرنے والی ہے؟ ___ اور اگر یہی بات ہے تو لیجئے ہم ایک تحقیق جو ابھی ابھی ارتجالاً" یعنی فی البدیہہ ہو گئی ہے' عرض کرتے ہیں۔ عرض کیا ہے کہ مقبرہ نور جہاں دراصل مقبرہ نور جان ہے۔ یہ نور جان نسلاً" پٹھان تھا اور جہانگیر کا کوئی محبوب مقرب تھا۔ مرا تو جہانگیر نے اسے یہ مقبرہ انعام میں دیا مگر کتابت کی غلطی ہو گئی اور مقرب نور جان مقبرہ نور جہاں بن کر رہ گیا' حالانکہ نور جہاں کا مقبرہ تو سری نگر میں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا علم' ہمارے سمیت کسی کو نہیں ہے ___ اور علم ہونا ضروری بھی نہیں ہے کیوں کہ تحقیق کی نہیں جاتی' تحقیق تو ___ محبت کی طرح ___ شعر کی طرح ___ بس ہو جاتی ہے!

(۱۹۶۴ء)

پرانے بیکار محاورے

وفاقی وزیر خزانہ نی سینٹ میں مہنگائی کے متعلق تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسلام آباد میں تاجر' عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ ادھر عوام کا خیال ہے کہ صرف اسلام آباد ہی میں نہیں بلکہ ملک کے ہر شہر اور قصبے اور گاؤں میں تاجروں نے عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا ترک کر دیا ہے۔ کہیں سے انہوں نے تیسرے ہاتھ کا بھی بندوبست کرلیا ہے۔ چنانچہ تاجر حضرات عوام صاحبان کو تین تین ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ مگر یہ بالکل الگ قصہ ہے۔ ہم تو انسانی اعضاء سے متعلق بعض محاوروں اور روزمروں کی بات کرنا چاہتے تھے کہ بیشتر ضرب الامثال کی طرح یہ محاورے اور روزمرے بھی کتنے بے معنی ہوتے ہیں۔

مثلاً" ضرب المثل ہے کہ جو گرجتے ہیں' وہ برستے نہیں۔ حالانکہ زمانہ حال کی موسمی تبدیلیوں کے مشاہدے کے بعد یوں کہنا چاہئے کہ جو گرجتے نہیں' وہ برستے ہی نہیں۔ برستا وہی ہے جو گرجتا ہے۔ جو گرج نہیں سکتا وہ برسے گا خاک! نہ جانے اس بزرگ نے' جس نے یہ ضرب المثل گھڑی تھی' کس صدی میں کون سا بادل دیکھا تھا جو گرجتا دہاڑتا تھی' کسی صدی میں سے ایک بوند بھی نہ ٹپکی۔ اب تو بادل کی گرج کو بادل کے برسنے کی تمہید سمجھا جاتا ہے اور طے پا چکا ہے کہ جو گرجتے ہیں' وہی برستے ہیں۔

یہی صورت دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کی ہے حالانکہ جب عوام کی لوٹ ہی معیار تجارت ٹھہرے تو تاجروں کے جسموں میں دس دس بیس بیس ہاتھ پیدا ہو جاتے ہیں جو عوام کو لوٹتے نہیں ہیں' کھسوٹتے ہیں۔ آدمی ایک ہاتھ سے بچتا ہے تو دوسرا ہاتھ اس کا راستہ روک لیتا ہے' وہاں بھی وہ غوطہ مار جائے تو اسے تیسرے اور پھر چوتھے' پانچویں' چھٹے ہاتھ سے نمٹنا پڑتا ہے۔ الغرض آدمی ان ہاتھوں سے بچ کر نہیں جاسکتا۔ پچھلے دنوں کسی صاحب نے کہا تھا کہ پی آئی اے کے ٹکٹوں کی شرح میں اضافے کے باوجود ہوائی اڈوں پر مسافروں کی اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ ٹکٹ آسانی سے حاصل نہیں ہوتا۔ تب ہمیں یاد آیا کہ آٹے کے ڈپوؤں اور تندوروں اور روٹی پلانٹوں پر عوام کی بھیڑ کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ان کے لئے آٹے اور روٹی کی قیمتیں قابل برداشت ہیں۔ حالانکہ بات اتنی سی ہے کہ آدمی ان سے بچ کے نکل ہی نہیں سکتا۔ روٹی کے بغیر چارہ نہیں۔ اسی طرح عجلت کے کاموں میں ہوائی سفر کے بغیر بھی چارہ نہیں۔ اس بے چارگی کو چارے کا نام نہیں دینا چاہئے۔

دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کی طرح "بائیں ہاتھ کا کھیل" کا روزمرہ بھی رائج ہے حالانکہ جو لوگ کھبے ہوتے ہیں یعنی بائیں ہاتھ سے لکھتے' کھاتے اور کھیلتے ہیں' انہیں یہ کہنا چاہئے کہ فلاں کام تو ان کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جن صاحب نے پہلی بار "بائیں ہاتھ کا کھیل" کے الفاظ استعمال کئے تھے' وہ سچے ہوں گے۔ اس لئے بڑی آسانی سے کھبوں کو بھول گئے جبکہ کھبا تو ایسی بلا ہوتی ہے کہ مثال کے طور پر اگر کرکٹ کے میدان میں ایک کھبا بیٹسمین اترے تو اس کی خاطر مقابل کی ٹیم کو اپنی پوری فیلڈ بدلنی پڑجاتی ہے۔ یہ بیٹسمین یوں کیوں نہ کہے کہ چوکے لگانا تو میرے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

ایک کان سے سننا اور دوسرے کان سے نکال دینا بھی غلط ہے کہ آدمی دونوں کانوں سے بالکل اس طرح بہ یک وقت سنتا ہے جیسے وہ دونوں ہاتھوں سے بہ یک وقت لوٹتا ہے۔ بفرض محال اگر وہ ایک ہی کان سے سنتا ہے تو یہ بالکل ضروری نہیں

ہے کہ اس نے جو کچھ سنا ہے' وہ دوسرے کان سے نکالے۔ وہ جس کان سے سنتا ہے' اسی سے نکال بھی تو سکتا ہے اور پھر ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنا' اس لیے بھی غلط ہے کہ آدمی نے جو کچھ سنا ہے' اسے نکالنے کے قدرت نے اسے منہ بھی تو دے رکھا ہے۔ سو کہنا یوں چاہئے کہ دونوں کانوں سے سننا اور منہ سے نکال دینا۔ ایک کان سے سننے کی بات کرنے کا حق صرف اس شخص کو ہے جس کے دوسرے کان کا پردہ پھٹ گیا ہو' چنانچہ میڈیکل ٹسٹ کے بغیر اس محاورے کو استعمال کرنے کا حق کسی کو نہیں دینا چاہئے۔

ایک کان سے سننے کی طرح ایک آنکھ سے دیکھنے کا محاورہ بھی بہت عام ہے۔ فلاں آدمی سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے ـــــ یہ ہر لحاظ سے غلط ہے۔ انسان جب بھی دیکھتا ہے' دونوں آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ ایک آنکھ سے صرف اس صورت میں دیکھتا ہے جب اس کی دوسری آنکھ صفر ہو۔ سو جب کوئی دو آنکھوں والا کہے کہ میں تو سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہوں' تو اسے صاف صاف بتا دینا چاہئے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو اور اگر ایک آنکھ سے دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب کو برابر دیکھتا ہے' تو سوال یہ ہے کہ اگر وہ ایک آنکھ سے کسی کے منہ پر شرافت دیکھتا ہے تو کیا دوسری آنکھ سے خباثت دیکھتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جب وہ ایک آنکھ سے دیکھتا ہے تو ریاکاری کرتا ہے۔

اگر کوئی کہتا ہے کہ میں تمہاری بتیسی جھاڑ دوں گا' تو کم سے کم ہم تو پورے اعتماد کے ساتھ اسے کہہ سکتے ہیں کہ میاں' تم دوسری بار بھی پیدا ہو کر آؤ تو ہماری بتیسی نہیں جھاڑ سکتے کیونکہ ہمارے منہ میں تو کل انتیس دانت ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے' تو اس پر واضح کیا جاسکتا ہے کہ بھوت کو صرف باتوں ہی سے قائل کیا جاسکتا ہے ورنہ تم اسے لات مارو گے تو بس ہوا میں مارتے پھرو گے۔ بھوت تو غیر مرئی اجسام ہیں۔ انہیں لات چھو ہی نہیں سکتی۔ ان کے احساس کو تمہاری بات چھو جائے تو یہ الگ بات ہے۔

(۱۹۷۶ء)

بڑے لوگوں کی یادگاریں

مولانا عبدالمجید سالک مرحوم و مغفور کی ایک برسی پر لاہور میں بزم ثقافت کے والوں نے ایک جلسہ منعقد کیا تھا' جس کی صدارت ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کی تھی۔ انہوں نے خطبہ صدارت میں یہ تجویز پیش کی کہ بڑی بڑی ادبی و فنی شخصیتوں کے مکانوں کو یا ان مکانوں میں ان کے پڑھنے لکھنے کے کمروں کو بطور قومی یادگار محفوظ کرلیا جائے۔ انہوں نے بتایا کہ انگریزی شاعر کیٹس جس کمرے میں رہتا تھا' وہ اسی طرح محفوظ رکھا ہے۔ وہ قلم تک موجود ہے جو کیٹس استعمال کرتا تھا اور وہ کرسی تک رکھی ہے جس پر بیٹھ کر وہ فکر فن کرتا تھا۔ بعینہ جرمن شاعر گوئٹے کا کمرہ اس سلیقے سے محفوظ ہے کہ اسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گوئٹے بس ابھی ابھی اٹھ کر باہر گیا ہے اور ابھی واپس آکر تخلیق فن میں مصروف ہو جائے گا۔ مگر کیا ستم ہے کہ لاہور میں علامہ اقبال کے سوا یہاں کے بڑے لوگوں کے خاص کمرے کو کوئی یادگار کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ مولانا ظفر علی خاں' مولانا عبدالمجید سالک' پطرس بخاری اور مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ ہم نے اچھا سلوک نہیں کیا حالانکہ یہ لوگ اس ملک کی تہذیب و ثقافت اور علم و فن کی عزیز متاعیں تھے۔

تجویز نہایت معقول ہے اور ہم اس کی پر زور تائید کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اس خطرے کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ادھر ان بزرگواروں کے کمروں میں ان کے

لکھنے پڑھنے کا سامان سجا کر انہیں قومی یادگاروں میں بدلا جائے گا' ادھر یہ سامان آہستہ آہستہ غائب ہونے لگے گا۔ حتیٰ کہ کچھ عرصے کے بعد بس خالی ڈھنڈار کمرے باقی رہ جائیں گے۔ اس خطرے کا پس منظر یہ ہے کہ ہم لوگوں کے ہاں قومی یادگاروں کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ ہماری دیانت کا معیار تو یہ ہے کہ ان کا قلم اس عقیدت سے نہیں دیکھیں گے کہ اس کی نوک نے کیسے شاہپارے تخلیق کئے ہیں۔ ہم تو اسے صرف اس نیت سے دیکھیں گے کہ اگر دوسرے لوگوں کی نظر بچا کر اسے جیب میں ڈال لیا جائے اور بازار میں جا کر بیچ دیا جائے تو کتنے دام کھرے ہوں گے۔

جس ملک کی مساجد میں سے نمازیوں کے جوتے چوری ہو جاتے ہوں اور اس چوری کے ڈر سے یہ منظر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ نمازی وضو کرنے کے بعد نمازیوں کی صف میں شامل ہونے کو یوں بڑھ رہا ہے کہ ہاتھ میں جوتے ہیں اور وہ صف میں شامل ہوتے ہی اپنا جوتا ایسے مقام پر رکھتا ہے جہاں رکوع و سجود میں اس کی نظر جوتے پر رہے' یعنی جب خانہ' خدا میں رکھے ہوئے سامان پر ہاتھ صاف کرنے سے لوگ باز نہیں آتے تو ان بزرگوں کے گھروں کے سامان کا کون احترام کرے گا۔ جس ملک کی لائبریریوں میں قیمتی کتابوں میں سے پسندیدہ اوراق پھاڑ لئے جاتے ہوں اور جو لوگ باغ کی سیر کو جائیں تو پھولوں پر پان کی پیکیں تھوکتے پھریں' ان سے ہم یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ ان کی دست برد سے پطرس کا قلم' ظفر کی ٹوپی' سالک کی عینک اور مہر کی چھڑی محفوظ رہے گی۔

یہاں مسلمانوں کے ملک کے ایک شہر لاہور میں ایک بار یہ تجربہ ہوا تھا کہ جس طرح یورپ کے عیسائی ملکوں کے شہروں میں اخباروں کے سٹالوں پر کسی آدمی کی موجودگی ایسی ضروری نہیں ہوتی اور لوگ اپنے پسندیدہ اخبار اٹھا کر اور ان کی قیمت کاؤنٹر پر رکھ کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ اسی طرح اہل لاہور کی دیانت کا بھی امتحان لیا جائے۔ سو لکشمی چوک کے ایک مقام پر اخبار رکھ دیئے گئے۔ دوپہر کو جب تجربہ کرنے والے بزرگ تشریف لائے تو وہاں نہ اخبار تھے اور نہ اخبار کے پیسے تھے۔

صرف ایک رکشا کھڑا اپنی بریکیں ٹھیک کر رہا تھا۔ سنا ہے یہ صاحب جب اخبار رکھ کر رخصت ہوئے تو آس پاس کے محلوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ آج لکشمی چوک میں اخبار مفت تقسیم ہو رہے ہیں۔ سو لوگ باگ جھپٹے اور آن کی آن میں صفایا کر دیا۔

کراچی میں ایک بار سڑکوں پر پبلک ٹیلیفون بوتھ لگائے گئے تھے تاکہ پبلک کو سہولت رہے۔ پبلک نے اس سہولت سے یقیناً فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ جب دوسرے روز محکمہ ٹیلیفون کے اہلکاروں نے ان دو دراز کے بوتھوں کا معائنہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ پبلک ٹیلی فون اٹھا کر اور تار کاٹ کر لے گئی ہے اور بعض حضرات نے تو ان بوتھوں کا "بوتھا" یوں بگاڑا ہے کہ انہیں بطور بیت الخلا استعمال فرمایا ہے۔ بلکہ ان میں سے بعض تو یہ کہتے بھی پائے گئے کہ آخر بیت الخلاؤں میں ٹیلیفون لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا انتظامیہ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم خلا نورد نہیں ہیں' بیت الخلا نورد ہیں اور ہمیں ان بوتھوں میں ٹیلیفون کی نہیں' لوٹے کی ضرورت ہے۔

(۱۹۷۳ء)

قصہ ایک فلم کے گیتوں کا

فلمی صنعت کے نمائندوں کے ایک اجلاس میں ہمیں بھی مدعو کیا گیا تھا' اگرچہ یہ بات اب تک سمجھ میں نہیں آئی کہ کیوں مدعو کیا گیا تھا۔ ہم نے بصد ادب معذرت کرلی کہ جس کوچے میں قدم ہی نہ رکھا ہو' اس کی آب و ہوا کے بارے میں ہم کس منہ سے عرض کریں۔ دو فلموں کے مکالمے لکھے۔ ہماری ایک کہانی استعمال فرمالی گئی اور بعد میں جب ہماری ملکیت ثابت ہوگئی تو ہمیں کہانی نویس کا نگار ایوارڈ بھی مل گیا۔ اس کے علاوہ ہماری کوئی فلمی مصروفیت نہیں ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے دہلی میں مقیم کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو نے ایک کہانی "بنجارا" لکھی اور ایک سیٹھ (منور نجن پکچرز) کے ہاتھ بیچ دی۔ دونوں دوستوں نے ہمیں ملتان سے دہلی بلایا کہ اس کہانی کے گانے لکھ دیں۔ وہ ہم نے لکھ دیئے۔ معاوضے میں ملنے والی رقم ہم تینوں نے برابر برابر بانٹ لی۔ ہماری بلا جانے کہ وہ فلم بنی یا نہیں۔

اس آخری واقعے کا ایک نکتہ بے حد دل فریب ہے۔ جب ہم نے "بنجارا" کے گانے لکھ لئے اور میوزک ڈائریکٹر فیروز نظامی نے انہیں پاس کر دیا تو ہم سیٹھ کو گانے سنانے اور معاوضہ وصول کرنے چلے۔ راستے میں منٹو نے ہمیں سمجھایا۔ "یہ فلمی دنیا ہے۔ یہاں انا ونا کا قصہ نہیں چلتا۔ جو کچھ سیٹھ کہتا ہے' وہی سچ ہے۔ باقی سب جھوٹ ہے۔ آپ شاعر لوگوں کی انا کی دھار بالکل استرے کی دھار ہوتی ہے مگر یہاں

استرا نہیں چلے گا۔ سیٹھ اگر کہے کہ یہ ٹھیک ہے تو آپ کہئے گا کہ یہی ٹھیک ہے۔ اگر سیٹھ کہے گا کہ وہ ٹھیک ہے تو آپ کہئے گا وہی ٹھیک ہے۔ سمجھے آپ؟ بس آمنا و صدقنا کہتے چلے جایئے گا تاکہ چیک وصول ہو اور اسے آج ہی کیش بھی کرالیا جائے کہ سیٹھوں کا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا"۔

ہم تینوں بلکہ چاروں (کہ شاید فیروز نظامی بھی ہمارے ہمراہ تھے) سیٹھ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ہم آج سے چالیس بیالیس سال بعد بھی قسم کھاکر کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے کسی انسان کو اتنے بے ہنگم موٹاپے میں آج تک مبتلا نہیں دیکھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ سیٹھ ہم سے دو سال چھوٹے نکلے! ناک نقشہ ٹھیک ٹھاک تھا مگر موٹاپے کی وجہ سے ناک کی جگہ نقشہ آگیا تھا اور نقشے میں ناک کہیں ڈوبی پڑی تھی۔ گیت سنانے کا حکم ہوا تو ہم نے سنائے اور ساتھی ہمیں داد دیتے رہے۔ سیٹھ کی مسکراہٹ سے ظاہر تھا کہ گیت انہیں بھی پسند ہیں مگر داد دے کر وہ ہمارے معاوضے میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے۔

آخر ایک مرحلے پر جب ہم نے گیت کا ایک مصرع کچھ اس طرح کا پڑھا۔

یہ آرزو ہے کہ تیرے در پر!

"آرزو؟" سیٹھ کے اندر سے آواز برآمد ہوئی۔ "آرزو نہیں چلے گا کوی صاحب آشا رکھیے آشا۔ آرزو ہٹا دیجئے۔" ہم منٹو کی ہدایات کے مطابق یہ کہنے ہی والے تھے کہ بہت اچھا' ہٹا دیں گے' مگر معاً منٹو بولے۔ "کیوں سیٹھ صاحب۔ آرزو کیوں ہٹے؟ آشا کا یہ مقام نہیں ہے۔ یہ آرزو کا مقام ہے۔ شاعری کی سمجھ نہ ہو تو اعتراض نہیں کیا جاتا۔ آرزو ہی رہے گا۔ یہ نہیں بدلا جاسکتا!" ___ اس دوران میں کرشن چندر ہمیں اور ہم کرشن چندر کو حیرت سے دیکھتے رہے کہ دس منٹ پہلے کے ناصح منٹو کو یکایک کیا ہوگیا ہے۔ یہ تو چیک کا قصہ ہی تمام کردے گا! مگر تب منٹو سے شکست مان کر سیٹھ بولا۔ "اچھا بابا' آرزو چلنے دو' تم بولتا بہت اونچا ہے۔ نیچا بولا کرو!"

(۱۹۸۴ء)

انسان اور سائنس

آج سے کم و بیش ۳۴ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ہاتھ میں اخبار تھا اور وہ خاصے پریشان نظر آرہے تھے۔ وجہ پوچھی تو بولے۔ "سب دوستوں کو آج کی ایک خبر دکھا کر پوچھتا پھرتا ہوں کہ اب کیا ہوگا۔ یہ خبر پڑھ کر کوئی خوش ہوتا ہے' کسی کو تشویش لاحق ہو جاتی ہے' مگر میں عجب گومگو کی حالت میں ہوں کہ خوشی بھی ہو رہی ہے اور تشویش بھی ہے۔ ادھر روس میں سائنس دانوں نے ایک کتے کا خون اس کے جسم میں سے نکال لیا اور ظاہر ہے کہ کتا مرگیا۔ اس کے خون کو اسی درجہ حرارت میں رکھا گیا' جو کتے کا درجہ حرارت تھا۔ کتا پندرہ بیس منٹ تک مرا رہا۔ پھر یہی خون اس کے جسم میں انجکٹ کرایا گیا تو وہ زندہ ہوگیا اور پھر اٹھ بیٹھا اور پھر بھاگنے دوڑنے لگا۔ کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے اور پھر کیا یہ تشویش کی بھی بات نہیں ہے؟"

اس سے سات آٹھ سال پہلے جب جنگ عظیم کے آخری دنوں میں امریکہ نے ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا تھا اور اس بم کی تباہ کاریاں اخباروں میں چھپی تھیں تو منٹو نے ہمیں بمبئی سے لکھا تھا کہ اب زمین پر انسان کے زندہ رہنے کا کیا فائدہ ہے جبکہ اسے یکایک اجتماعی موت کے غار میں دھکیلا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں یہ ادب کیا ہے' یہ شاعری کیا ہے' یہ عقیدہ کیا ہے---یہ سب بے معنی اور بے کار ہے۔ ایک

ایٹم بم دس سیکنڈ کے اندر صدیوں کی تہذیب و ثقافت کو راکھ میں بدل سکتا ہے تو کیا زندگی سے زیادہ بے معنی چیز بھی کوئی ہو سکتی ہے!--- منٹو اب بھی پریشان تھے مگر اس پریشانی کے حاشیے اس خیال سے چمک رہے تھے کہ انسان موت کا علاج ڈھونڈنے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔

اس روز منٹو نے کہا تھا۔ "بڑا مزہ آئے گا جب میں تم سے ملنے آؤں گا اور تمہارے گھر سے مجھے اطلاع دی جائے گی کہ تم فی الحال مرے پڑے ہو۔ تمہیں پھوڑوں پھنسیوں کی شکایت ہوگئی تھی چنانچہ تمہارے جسم کا سارا خون نکال کر لیبارٹری میں صفائی کے لئے بھیج دیا گیا ہے اور تمہارا انتقال ہوا پڑا ہے۔ مجھ سے کہا جائے گا کہ گھنٹہ بھر بعد آئیے گا۔ جب تک خون لیبارٹری سے آچکا ہوگا اور واپس تمہارے جسم میں انجیکٹ کیا جاچکا ہوگا اور تم زندہ ہو کر بیٹھے چائے پی رہے ہوگے۔ کتنے مزے کی صورت حال ہے۔ مگر اس طرح کا حادثہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ لیبارٹری میں تمہارا خون کسی اور خون سے بدل جائے اور یہ خون تمہارے جسم میں داخل کیا جائے تو تم "بڑھکیں" مارنے لگو اور گنڈا سے تولنے لگو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خون کو واپس جسم میں داخل کرتے ہوئے ڈاکٹر سے کوئی غلطی ہو جائے اور تم مرے کے مرے پڑے رہو اور پھر سے زندہ ہونے کے لئے تمہیں قیامت کا انتظار کرنا پڑے۔"

یہ واقعہ آج سے کم و بیش بتیس برس پہلے کا ہے مگر شاید لوگ اسے بھول بھال گئے تھے کیوں کہ اب روس ہی سے مردہ کتے کو زندہ کرنے کے سلسلے میں ایک اور خبر آئی ہے تو لوگ حیران و پریشان ہوگئے ہیں اور کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اس طرح کا تجربہ تو پہلے بھی ہو چکا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ماضی میں کتے کے جسم میں سے خون نکال کر اسے مار ڈالا گیا تھا۔ اب کے اسے ویسے ہی مار دیا گیا ہے۔ پہلے اس کے جسم میں اسی کا خون داخل کر کے اسے زندہ کیا گیا تھا۔ اب اس کے حلق میں کوئی دوا ٹپکا کر اسے زندہ کیا گیا ہے مگر دونوں واقعات میں یہ بات مشترک ہے کہ

موت پر فتح یاب ہونے کی کوشش جاری ہے اور تجربات سے ظاہر ہے کہ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی حد تک انسان موت پر فتح پالے گا۔ مگر ہمیں تشویش یہ ہے کہ اگر انسان نے مرنے سے انکار کر دیا اور بچوں کی پیدائش جاری رہی تو کہیں یہ نہ ہو کہ انسان، انسانوں کو کھانے لگیں اور بھیڑ بھاڑ کا یہ عالم ہو کہ جس طرح آج کل لوگ مکان بنانے کے لئے پلاٹ ڈھونڈتے ہیں۔ اسی طرح انسان کھڑا ہونے کی جگہ حاصل کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دے!۔ ہمارے خیال میں قانون قدرت ہی درست ہے، اسی کو چلنے دینا چاہئے۔ مرنا تکلیف دہ سہی مگر آخر زندہ رہنے کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے!

(۱۹۸۴ء)

ملاوٹ کی سائنس

ایک اخباری رپورٹ کے مطابق آج سے پانچ ہزار سال پہلے بھی اشیائے خوردنی میں ملاوٹ ہوتی تھی۔ یہ انکشاف حیرت افزا ضرور ہے مگر حوصلہ افزا کسی صورت میں نہیں۔ بعض لوگ اپنے جرائم کا جواز یوں پیدا کرتے ہیں کہ ماضی کی تاریخ سے ایسے ہی جرائم کی مثالیں ڈھونڈ لاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ جب یہ سب کچھ پہلے بھی ہوتا رہا ہے تو آج بھی کیوں نہ ہو۔ ویسے جن حضرات نے آج سے پانچ ہزار سال پہلے کی اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کا کھوج لگایا ہے' ان سے پوچھنا چاہئے کہ یہ اشیاء انہیں کہاں سے دستیاب ہوئیں یا اس ملاوٹ کا ذکر انہیں زمانہ قدیم کی کس لاٹھ پر کھدا ہوا ملا۔ ہم نے تو سنا تھا کہ ان زمانوں میں ملاوٹ کا تصور ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ ملاوٹ تو اس وقت پیدا ہوئی جب انسان کے ایمان و ضمیر میں ملاوٹ ہو گئی۔

سنا ہے' ایسے انتظامات ہونے والے ہیں کہ ہر بڑے شہر میں کوئی بھی شہری چند گھنٹوں کے اندر اندر اشیاء کا تجزیہ کرا سکے گا اور ان کے خالص یا ناقص ہونے کے بارے میں رپورٹ حاصل کر سکے گا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس ساری کاوش کے بعد وہ اس رپورٹ کا کیا کرے گا۔ یعنی کیا اسے فریم میں سجا کر اپنے گھر میں آویزاں کر دے گا یا اسے تھانے میں پیش کر کے ملاوٹے کو گرفتار کرائے گا اور پھر یہ ملاوٹیا

اصلی تے وڈے ملاوٹے کو گرفتار کرائے گا اور لیبارٹری کی ایک رپورٹ معاشرے کے قاتل عناصر کے ایک گروہ کے گروہ کو قانونی شکنجے میں لانے کی موجب بن جائے گی۔ کچھ بھی ہو' فی الحال یہی تسکین بہت ہے کہ رپورٹ تو حاصل کی جا سکے گی۔ ہماری دعا ہے کہ واقعی حاصل کی جا سکے۔

رپورٹ کے مطابق شیرے کو صاف کر کے اسے شہد کا نام دے دیا جاتا ہے مگر ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم نے شہد کے جو دو ایک نمونے دیکھے ہیں' ان میں شیرے کو صاف بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں تنکے تھے' چیونٹیاں تھیں' مکوڑے تھے۔ غرض حشرات کی لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ بیچنے والے سے پوچھا کہ آخر تمہارے شہر میں کشتوں کے پشتے کیوں لگ رہے ہیں؟ جواب ملا کہ حضور' یہ چیزیں شہد کی طرف نہیں آئیں گی تو کیا مولیوں پر بیٹھیں گی۔ مکوڑوں کے یہ پنجر تو شہد کے خالص ہونے کا ثبوت ہیں۔ خالص شہد کا خاصہ ہے کہ جو چیز قریب آتی ہے' اسے وہ اپنے شکنجے میں کس لیتا ہے۔ مکھی کتنی بے قرار چیز ہے' مجال ہے جو وہ آپ کی زد میں آئے مگر وہ دیکھئے بوتل کی تہ میں کیا پڑا ہے۔ یہ وہ مکھی ہے جس نے ادھر شہد کو چھوا' ادھر اس کی روح قبض ہو گئی۔

چائے میں جو ملاوٹ ہوتی ہے' اس کی تفصیل یوں بتائی گئی ہے کہ ابلی ہوئی چائے کی پتی کو خشک کر کے اس پر "ٹی کلر" چڑھا دیا جاتا ہے اور یہی ابلی ہوئی پتی گھروں میں پھر سے ابالی جانے لگتی ہے۔ جن تاجروں کو استعمال شدہ پتی کی نعمت میسر نہیں آتی' وہ بڑی محنت سے چنے کی بھوسی' ماش کی دال کا چھلکا' بیری اور شیشم کے پتوں کو ٹی کلر دے کر چائے بناتے ہیں' نیز لکڑی کے برادے پر بھی ٹی کلر خوب چڑھتا ہے۔ حیرت ہے کہ اس تفصیل میں نہ تو کیکر کی چھال کا ذکر ہے اور نہ گھوڑے کی لید کا' جب کہ یہ "اشیائے خوردنی" ٹی کلر کو یوں قبول کرتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے یہ چائے کسی اصطبل کی بجائے سیدھی سری لنکا کی پہاڑیوں سے آئی ہے۔

بتایا گیا ہے کہ بناسپتی گھی میں چربی' موبل آئل اور گریس ملانے کا رواج ہے۔

پھر دیسی گھی میں ملاوٹ کے لئے اس گھی کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر اسے زیادہ دیسی بنانے کے لئے آلو بھی ملائے جاتے ہیں اور وائٹ آئل بھی۔ چینی میں میدہ اور سوپ اسٹون کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ دودھ میں جوہڑوں کے پانی کے علاوہ سنگھاڑے کا آٹا بھی آمیز کیا جاتا ہے تاکہ بالائی کی تہہ لحاف کے برابر اترے۔ اسی طرح چنے کی دال کے بیسن، کھلی اور چاول کی بھوسی میں ملتانی مٹی ملا کر ہلدی تیار کی جاتی ہے اور پسی ہوئی مرچوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے ہماری لیبارٹریوں کو بھی اس امر کا سراغ نہ ملا ہو مگر یہ بھی سنا ہے کہ دودھ میں زیادہ سے زیادہ بالائی پیدا کرنے کے لئے سنگھاڑے کے آٹے کے علاوہ آج کل بلاٹنگ پیپر (سیاہی چوس) بھی افراط سے استعمال کیا جارہا ہے۔ یہ پورے دودھ کو بالائی میں بدل ڈالتا ہے اور افواہ ہے کہ انسان کے معدے میں اتر کر اس کے خون کو سیاہی سمجھ لیتا ہے اور اسے چوسنے بیٹھ جاتا ہے۔

اول تو ہم ملاوٹیوں کی قوت متخیلہ کو داد دیتے ہیں کہ انہیں کتنی دور کی سوجھتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے اپنے ہاں لیبارٹریاں قائم کر رکھی ہیں جن میں نت نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں کہ کون سی غیر خوردنی شے کن کن اشیائے خوردنی کا سوانگ بھر سکتی ہے۔ دوم ان سرکاری عہدے داروں کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے کو جی چاہتا ہے جو گذشتہ کئی برس سے ملاوٹ کے تدارک پر مامور ہیں مگر ملاوٹ میں تدارک کی بجائے ترقی ہی ہو رہی ہے۔ ان کی ثابت قدمی قابل داد ہے کہ وہ ملاوٹ کو روکنے کی تنخواہیں بھی لے رہے ہیں مگر ساتھ ہی ملاوٹ بھی ہو رہی ہے۔ یوں سمجھئے کہ ملاوٹ کو روکنے اور ملاوٹ کرنے کے درمیان "نک ٹو نک neck to Neck" ریس گذشتہ کتنے برس سے جاری ہے اور یہ کوئی معمولی کارکردگی نہیں ہے۔

(۱۹۶۸ء)

ہوائی جہاز میں اونٹ

ایک حکمران نے ایک اور حکمران کو عربی نسل کے دو گھوڑوں اور دو اونٹوں کا تحفہ بھیجا۔ ملکوں کے سربراہوں کے درمیان اس طرح کے تحفوں کے تبادلے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تبادلہ خیال نہ کیا' تبادلہ تحائف کرلیا۔ مگر اس تحفے کا جو پہلو ہمیں بہت دلچسپ لگا' وہ یہ ہے کہ ان گھوڑوں کے علاوہ اونٹوں کو بھی ہوائی جہاز کے ذریعے بھجوایا گیا اور وہ پہنچ بھی چکے ہیں۔

ہمیں اس خبر میں دلچسپی یوں محسوس ہوئی کہ ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے اونٹ کیسا لگتا ہوگا۔ اسے ہوائی جہاز میں سوار کیسے کیا جاتا ہوگا اور پھر اتارا کیسے جاتا ہوگا اور جب اونٹ ہوائی جہاز میں سے نکلتا ہوگا تو کیسا منظر ہوتا ہوگا! کاش ان اونٹوں کی تصویریں اخباروں میں شائع کی جاتیں تاکہ یہ تمام مراحل محفوظ ہو جاتے کہ طیارے میں چڑھنے اور اس میں سے اترنے کے لئے اونٹ کس طرح کی سیڑھی استعمال کرتا ہے اور جب وہ اترتا ہے تو پہلے اپنی گردن کھڑکی سے باہر نکلتا ہے یا ٹانگ اور جب پرواز کے دوران میں خراب موسم کی وجہ سے جھٹکے ہوتی ہے تو اونٹ پر کیا کیا قیامتیں گزر جاتی ہیں۔

اسے ہماری بے خبری قرار دے لیجئے کہ ہم اونٹ کے ہوائی سفر کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ مانا کہ اونٹ کو صحرا کا جہاز کہا جاتا ہے مگر یہ خشکی پر چلنے والا جہاز

اور ہوائی سفر تو ہوا میں ہوتا ہے۔ ویسے تو ہاتھی اور گینڈے بھی ایک دوسرے کو "لوٹے" بھیجے جاتے ہوں گے اور ظاہر ہے ہوائی جہازوں ہی سے بھیجے جاتے ہوں گے مگر اونٹ کچھ ایسا بے ڈھنگا سا جانور ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا' اسے ہوائی سفر کے آداب کیسے سکھائے جاتے ہوں گے اور اگر طیارے کے ہوا میں بلند ہوتے ہی اونٹ کودنے پھاندنے اور رسے تڑانے لگے تو اونٹ پر جو گزرے گی سو گزرے گی' اس طیارے پر کیا گزرتی ہوگی' جس نے اپنے اندر ٹیڑھی کلوں والے اس جانور کو سمیٹ رکھا ہے۔

اونٹ قسطوں میں بیٹھنے اور قسطوں میں اٹھنے والا جانور ہے۔ ظاہر ہے کہ طیارے میں اس کی جملہ اقساط کا لحاظ رکھ کر اس کے لئے گنجائش پیدا کی جاتی ہوگی۔ اس صورت میں تو آدھا طیارہ اونٹ کے قبضے میں چلا جاتا ہوگا۔ گھوڑوں کی بات دوسری ہے۔ ان کے لئے اگاڑی پچھاڑی کافی و شافی ہے۔ اونٹ کی اگاڑی پچھاڑی باندھ بھی دیجئے تو اس کی گردن کو کیا کیجئے گا جو تمام اصول و ضوابط کو توڑتی ہوئی بس نکلی چلی جاتی ہے۔

ہم نے اونٹ کو چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے ہوئے تو ہزار بار دیکھا ہے' اس پر کجاوہ کس کر بیسیوں بار لمبے سفر بھی کئے ہیں مگر اونٹ کا جو منظر ہم نے ضلع میانوالی کے ایک قصبہ موچھ میں دیکھا تھا' وہ بڑا ہی عبرتناک تھا۔ اس طرف ہم چند دوستوں سے ملنے گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ آج دو اونٹوں کی لڑائی ہے۔ یہ لڑائی دیکھنے ہم بھی پہنچے۔ سینکڑوں کا مجمع تھا۔ مقابلے میں شامل اونٹوں کو سجا کر میدان میں لایا گیا۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی بلبلانے اور منہ میں سے "لوٹے" سے نکالنے لگے۔

ان کی لڑائی شروع ہوئی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے ہمارے پہلوانوں سے باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے۔ ٹانگوں اور گردن سے انہوں نے ایسے ایسے داؤں دکھائے' ایسے ایسے پیچ ڈالے کہ ہم تو حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر اچانک یوں ہوا کہ ایک اونٹ ہمت ہار بیٹھا اور شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ فاتح اونٹ نے اس کا پیچھا کیا۔

یہ اونٹ جس طرف کو بھاگے جا رہے تھے' اس طرف کا مجمع بھاگ کر دائیں بائیں جانب بکھر گیا۔ معلوم ہوا کہ جب اونٹ شکست کھا کر بھاگتا ہے تو آگا پیچھا نہیں دیکھتا۔ ناک کی سیدھ میں بھاگتا ہے اور کوئی راستے میں حائل ہو تو اسے لتاڑتا ہوا گزر جاتا ہے۔

اللہ اللہ ! اتنا لمبا چوڑا جانور جب شکست کھا کر بھاگا تو اس کی گردن تیر کی طرح سیدھی ہو گئی اور اس کی ٹانگیں اس تیزی سے چلنے لگیں جیسے اس نے ہر ٹانگ کی جڑ میں کوئی رفتار افزا قسم کی مشین فٹ کرا رکھی ہے۔ تب ہم نے سوچا کہ جب بڑی بڑی شخصیتیں شکست کھا کر بھاگتی ہیں تو اس اونٹ کی طرح کتنی مضحکہ خیز لگتی ہیں۔

(۱۹۸۲ء)

رویت ہلال عید

دیکھیں اب کے رویت ہلال کمیٹیوں کو عید کے کتنے درجن چاند نظر آتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ضروریات زندگی کی گرانی کے باعث لوگوں کی بصارت بڑی تیز ہو رہی ہے اور انہیں دن کے وقت تارے نظر آنے لگے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ تیسویں روزے کی عین دوپہر کو نقارے پر چوٹ پڑ جائے اور گولے چھوٹنے لگیں اور اعلان کر دیا جائے کہ لوگوں کو دن کے وقت تاروں کے ہجوم میں چاند بھی نظر آگیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ تیسواں روزہ کب ہو گا' ہفتے کو یا اتوار کو؟

لاہور اور کراچی والوں نے پہلا روزہ ۲۲ مارچ کو ہفتے کے روز رکھا اور وہ پیر کو عید منانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ان کے روزے پورے تیس ہوں گے کیوں کہ پچھلے اور اس سے پچھلے سال رمضان المبارک انتیس دنوں کا تھا۔ پشاور والوں کو اس رائے سے تو اتفاق ہے کہ اب کے روزے پورے تیس ہوں گے مگر ان کی عید اتوار کو پڑ رہی ہے کیوں کہ انہیں رمضان المبارک کا چاند ایک دن پہلے ہی نظر آگیا تھا۔ اسی لئے وہاں کے مختلف مذہبی اداروں کے ۵۶ علماء نے اعلان کر دیا ہے کہ ہفتے کو تیس روزے پورے ہو جائیں گے۔

پشاور کے علمائے کرام کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن وہاں کی رویت ہلال کمیٹی کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور ہمیں یقین ہے کہ خود کمیٹی کی سمجھ میں

بھی نہیں آئی ہوگی۔ کمیٹی نے اعلان کیا ہے کہ اگر ہفتے کو مطلع ابر آلود ہو اور چاند نظر نہ آئے تو عید اتوار کو منائی جائے گی۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ اگر ہفتے کو مطلع ابر آلود بھی نہ ہو اور چاند بھی نظر نہ آئے تو کیا پشاور والوں کو اکتیس روزے رکھنا ہوں گے؟ یعنی یہ عجیب رویت ہلال کمیٹی ہے کہ رویت ہلال کا مژدہ صرف اس صورت میں سنا سکتی ہے جب آسمان ابر آلود ہو اور ہلال نظر نہ آئے۔

ظاہر ہے کہ کراچی اور لاہور کی رویت ہلال کمیٹیاں اس قسم کا اعلان جاری کر سکتی ہیں کہ اگر ہفتے کو مطلع ابر آلود ہو اور چاند نظر نہ آئے تو عید پیر کو منائی جائے گی۔ ایک عید کی دو عیدیں تو یہیں بن گئیں۔ اب آگے چلئے۔ بہت ممکن ہے کہ ہفتے کو آسمان کی ابر آلودگی کے باعث پشاور میں چاند نظر نہ آئے تو اس صورت میں بعض لوگ اتوار کے بجائے پیر کو عید منانا مناسب سمجھیں۔ اسی طرح لاہور اور کراچی میں بعض لوگ پشاور کے علمائے کرام کے ارشاد کے مطابق اتوار ہی کو عید منانے پر اصرار کریں۔ یوں دو عیدوں میں سے چار عیدیں نکل آئیں۔ اور عیدوں کا ایک تہائی درجن تو یہیں پورا ہو گیا کسی نے سچ کہا تھا؎

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

کسی زمانے میں رویت ہلال کمیٹی کے ممبر شاہی مسجد (لاہور) کے مینار پر چڑھ کر عید کا چاند دیکھتے تھے۔ ایک بار جب مطلع ابر آلود تھا تو ان حضرات کو ہوائی جہاز میں بٹھا کر بادلوں کے اوپر پہنچایا گیا۔ اب سپوتنگ کا زمانہ آگیا ہے۔ لیکن اگر امریکہ کی منت سماجت کر کے ہم رویت ہلال کمیٹی کے لئے ایک مصنوعی سیارے کا انتظام کرلیں تو اس کے ساتھ تین خطرات وابستہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ امریکی سیارہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اڑے اڑے' نہ اڑے نہ اڑے۔ دوسرے اگر سیارہ کمیٹی کو لے کر اڑ جائے تو اسے واپس کون لائے گا۔ اور تیسرے ایک ہزار میل کی بلندی پر جا کر تو کمیٹی کو چاند کے علاوہ سورج بھی نظر آجائے گا کیوں کہ اتنی بلندی پر تو طلوع وغروب ہی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

(۱۹۵۸ء)

مینڈک اور مکھی کی درآمد

انکشاف ہوا ہے کہ گذشتہ کچھ عرصے میں پاکستان نے مینڈکوں کی برآمد سے سے لاکھوں روپے کمائے۔ نہ جانے غیر ممالک نے ان مینڈکوں سے کیا کام لیا ہو گا۔ زمانہ بڑی ترقی پر ہے۔ کون جانے کہ مینڈکوں سے پانی نچوڑا گیا ہو' یا ان کی جلد سے مغربی خواتین کے غسل کا لباس تیار کیا گیا ہو۔ مگر ہمیں اس سے کیا غرض کہ ہمارے مینڈک کس کام آئے۔ ہمیں تو زرمبادلہ سے مطلب ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس بے ضرر جاندار کی برآمد سے ہم نے لاکھوں روپے کا زر مبادلہ کمایا اور یاد رکھئے کہ یہ معمولی رقم نہیں ہے۔ اس سے سو پچاس موٹر کاریں درآمد کی جاسکتی ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے عرض کیا کہ ہم لوگوں کو موٹر کاریں درآمد کرنے کا بڑا شوق ہے۔

مینڈک بہت معصوم جانور ہے۔ اس میں اگر کوئی خامی ہے تو صرف یہ ہے کہ جب اسے وافر پانی میسر آئے تو ٹرانے لگتا ہے اور رات رات بھر ٹراتا چلا جاتا ہے۔ اس کی مثال ان گپیوں کی سی ہے جو محفل میں بولنا شروع کرتے ہیں تو آگے پیچھے دیکھے بغیر بولتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ان کی گپیں بہت بے ضرر ہوتی ہیں۔ مثلاً" یہی کہ ہمارے دادا جان نے شیر کو دم سے پکڑ کر جھٹکا دیا تو اس کی کھال اتر کر ان کے ہاتھ میں آگئی اور شیر ننگا ہونے کے بعد مارے شرم کے ایک جھنڈ میں چھپ گیا

—— چنانچہ گپی لوگوں کا قصور صرف یہ ہے کہ سننے والوں کا بھیجا کھا جاتے ہیں۔ بعینہٖ مینڈک صرف کان کھاتا ہے اور کان یا بھیجا کھانا کوئی اتنا بڑا جرم نہیں کہ ایمان و ضمیر تک کو چبائے بغیر سموچا نگل لیا جاتا ہے اور لوگوں کے ماتھے پر ایک شکن تک نمودار نہیں ہوتی۔ جیسے ایمان و ضمیر کی بجائے رس گلا یا گلاب جامن نگلا گیا ہے۔

اتنے بے ضرر جاندار کے مقابلے میں اگر ایسے جان داروں کو برآمد کرنے کی کوئی سبیل پیدا کی جاتی جو ہماری صحت و سکون کے لئے عذاب بنے ہوئے ہیں تو یوں ہم کروڑوں کا زر مبادلہ بھی کما لیتے اور ان آفتوں سے بھی چھٹکارا حاصل ہو جاتا۔ مثلاً" کاش یکایک امریکہ کے کسی سائنس دان کو معلوم ہو کہ مکھی کے سینے میں یورینیم کے ذرات پائے جاتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس صورت میں اگر ہم فی پیسہ دس مکھیاں بھی برآمد کریں تو صرف لاہور شہر ایک ارب ڈالر کا زر مبادلہ کما سکتا ہے اور اس کے باوجود اگلی شپ منٹ کے لئے وافر مکھی بچائی جاسکتی ہے۔ اس رقم میں سے حکومت نصف اپنے پاس رکھ سکتی ہے۔ مگر باقی نصف کی مستحق ہماری کارپوریشن ہے جس کی مزید حوصلہ افزائی ہوگی تو وہ مزید مکھیاں کاشت کرے گی۔

اسی طرح ہم مچھروں سے چٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ مچھر کے جسم میں کوئی سائنس دان کوئی ایسا عنصر ڈھونڈ نکالیں جو چاند اور مریخ کی طرف جانے والے راکٹوں کے ایندھن میں ٹپکایا جائے تو راکٹ کی رفتار لاکھوں میل فی گھنٹہ ہو جائے۔ اس صورت میں محکمہ انسداد ملیریا اور کارپوریشن کو مشترکہ طور پر ایک ایکسپورٹ لائسنس دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح بھی صرف لاہور شہر کا مچھر کروڑوں سٹرلنگ کما سکتا ہے۔ دونوں ادارے مچھروں سے کمائے ہوئے روپے سے جگہ جگہ گندے پانی کے جوہڑ تعمیر فرما سکتے ہیں تاکہ مچھروں کی سپلائی میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو۔

پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ روسی سائنس دانوں نے بچھوؤں پر تجربے کر کے ثابت کیا کہ وہ تابکاری سے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔ بعینہٖ ہمارے ہاں کے جھینگروں

اور لال بیگوں پر تجربے کئے جاسکتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ حشرات جس مزے سے بیت الخلاؤں میں رہتے ہیں، اسی مزے سے خلاؤں میں بھی رہ سکتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جن حشرات پر بیت الخلائی یا خلائی سفر کا کوئی اثر نہیں ہوتا، ان کے عادات و خصائل ان انسانوں میں منتقل کرنے کی کوشش کی جائے گی، جنہیں خلاؤں میں جانے کا شوق ہوگا اور اس میں کیا حرج ہے۔ اگر ایک انسان چاند کی سیر کی خاطر چند ہفتوں کے لئے لال بیگ بن جائے۔ آخر اس دنیا میں رہنے کے لئے انسانوں کو ان میں کتنی بار حیوان بھی تو بننا پڑتا ہے۔

بہر حال ہمارے پیش نظر تو مینڈکوں کے حوالے سے مکھیوں، مچھروں، ٹڈیوں، جھینگروں، اور لال بیگوں کو دساور بھیج کر زر مبادلہ کمانے کا مسئلہ تھا۔ یہ تو خیر طے ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بے کار نہیں ہے۔ ایک صاحب نے کوڑے سے پٹرول نکال لیا تھا اور فارموسا کے ایک شخص نے چند مہینے پہلے اعلان کیا تھا کہ وہ لکڑی کو سونا بنانے پر قادر ہے۔ یہ تو ہوئیں سائنس کی باتیں، مگر ہمارے دیہات میں اب تک کالی کھانسی کا یہ مجرب نسخہ رائج ہے کہ مریض کو گدھی کا دودھ پلایا جاتا ہے اور وہ تندرست ہو جاتا ہے۔ صرف ماہرین کی توجہ درکار ہے کہ اس توجہ کی برکت سے مکھیوں اور مچھروں وغیرہ سے ہمارا چھٹکارا ممکن ہے اور قراین بتا رہے ہیں کہ صرف اس طرح ممکن ہے۔

(۱۹۶۸ء)

سڑکوں کی مرمت

کچھ عرصے سے لاہور کی متعدد سڑکوں کو سنوارنے کا کام ہو رہا ہے اور ہوتا کچھ یوں ہے کہ پہلے تو سڑک کو چوڑا کرنے کے لئے اس کے درخت کاٹ کر لکڑیوں کے ٹال پر بھجوا دیئے جاتے ہیں اور پھر سناٹا چھا جاتا ہے۔ کچھ مدت کے بعد سڑک میں اضافہ کرنے والے اضافی حصے کی کھدائی ہوتی ہے اور پھر اس محاذ پر خاموشی مسلط ہو جاتی ہے۔ مزید کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس جگہ پر روڑی بچھائی جاتی جانے لگتی ہے اور جب یہ بچھ چکتی ہے تو شاید روڑی کو خشک ہونے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بے چاری پرانی سڑک آدھی رہ جاتی ہے اور جب اس پر دو طرفہ ٹریفک چلتا ہے تو جس طرح انارکلی بازار میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ اسی طرح ان سڑکوں پر پہیے سے پہیہ رگڑ کھاتا ہے۔ اور تب کہیں جا کر انجن آتے ہیں اور سچ مچ کی سڑک تیار ہو پاتی ہے۔

ہمارے ایک کرم فرما لندن کا پھیرا لگا کر واپس آئے تو بتایا کہ ایک روز وہ اپنی قیام گاہ سے نکلے تو سامنے سڑک کے آرپار کھدائی ہو رہی تھی اور سڑک پر ٹریفک بند کر دی گئی تھی۔ انہیں بڑی مسرت حاصل ہوئی کہ لندن میں بھی سڑکوں کی ساتھ وہی کچھ ہو رہا ہے جو لاہور میں ہوتا ہے۔ اس سڑک کے بند ہو جانے کی وجہ سے انہیں ڈھائی میل کا فالتو فاصلہ طے کر کے منزل مقصود پر پہنچنا پڑا۔ شام سے پہلے

واپس قیام گاہ کی طرف آنے لگے تو ڈھائی میل کا وہی اضافی فاصلہ پھر طے کیا۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ سڑک کھودنے والے کوئی پائپ یا وائر بچھا کر چلے گئے ہوں گے اور سڑک اس آرپار کی خندق کی وجہ سے بند ہوگی۔ مگر جب وہ کھدائی کے مقام پر پہنچے تو یہ دیکھ کر انہیں بہت افسوس ہوا کہ سڑک پر ٹریفک جاری ہے۔

آس پاس کے لوگوں سے استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ سڑک کی کھدائی کرنے والوں نے ایک گھنٹے کے اندر کھدائی مکمل کر لی تھی۔ پھر وہاں ایک پائپ دبا کر خندق کو بھرا اور ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کی مرمت کچھ اس طرح مکمل کر دی جیسے یہ سڑک کبھی کھدی ہی نہیں تھی۔ کھدائی شروع ہونے کے زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے بعد ٹریفک کھول دیا گیا تھا اور مرمت کے مقام پر سے جب گاڑیاں گزرتی تھیں تو ذرا سا جھٹکا بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کیونکہ سڑک کے اس حصے کو سڑک کے ساتھ یکجان کر دیا گیا تھا۔ ہمارے کرم فرما کو بڑی حیرت ہوئی کہ لندن والے اتنے عجلت پسند کیوں ہوتے ہیں۔ بزرگ کہہ گئے ہیں کہ جلدی کام شیطان کا۔ چنانچہ لاہور والے یہ شیطانی نہیں کرتے۔ آہستہ آہستہ سہج سہج اکھیڑتے' ادھیڑتے اور مرمت کرتے ہیں اور بعض اوقات تو مرمت کرتے ہی نہیں کہ کیا پتہ سال دو سال بعد اسی مقام کی پھر سے کھدائی کرنی پڑ جائے۔ چنانچہ کھدائی کا حصہ کھدا رہے گا تو کھدائی میں آسانی رہے گی۔

لاہور میں ٹریفک کی ایک اور اصلاح ان دنوں بہت زوروں پر ہے۔ بڑے بڑے چوکوں میں بڑے بڑے گول چبوترے بنے ہوئے تھے جن میں سبزہ و گل کی بہار قابل دید ہوتی تھی۔ عام زبان میں اسے "گول چکر" کہتے تھے۔ ٹریفک میں ان گول چکروں کے قریب آتے ہی بریکیں لگتی تھیں اور گاڑیاں چوک میں مناسب رفتار سے چلتی ہوئی اپنی اپنی سڑک پر نکل جاتی تھیں مگر پھر کسی کو ان گول چکروں کی افادیت پر شبہ ہوا۔ سب سے پہلے لکشمی چوک کا گول چکر صاف کر دیا گیا اور وہاں ٹریفک سگنل لگا دیئے گئے۔ مگر اس تبدیلی سے ایسی افراتفری برپا ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ یہ چوک اس

بے پناہ حد تک لمبا چوڑا ہے کہ اس میں ہاکی' فٹ بال بلکہ کرکٹ تک کا میچ برپا ہو سکتا ہے۔ گاڑی سبز بتی دیکھ کر چوک عبور کرنے آگے بڑھتی ہے مگر ابھی چوک کے وسط تک پہنچتی ہے کہ سگنل بدل جاتا ہے اور مخالف سمت کا ٹریفک جاری ہو جاتا ہے۔

شاید متعلقہ حکام کو یہ منظر پسند آیا۔ چنانچہ انہوں نے یہی تجربہ چوک قرطبہ (چوک مزنگ چونگی) میں بھی کر ڈالا۔ "گول چکر" غائب کر دیا گیا اور ٹریفک کا انتشار شروع کر دیا گیا۔ سگنل بدلنے کے انتظار میں یہاں ٹریفک اتنی دیر تک رکا رہتا ہے کہ بعض گاڑیوں کا پیٹرول ختم ہو جاتا ہے اور بعض کی ہوا نکل جاتی ہے۔ اہل لاہور کا خیال ہے کہ انگلینڈ کی مہمان کرکٹ ٹیم کا ایک میچ اس چوک قرطبہ میں بھی ہونا چاہئے کہ گول چکر کے بعد یہ ایک مثالی پلے گراؤنڈ بن چکا ہے۔ یہ تو قارئین کو یاد ہی ہوگا کہ کسی زمانے میں اس چوک کی اتنی کھدائی ہوئی تھی کہ خطرہ تھا کہ کہیں اس کے نیچے سے تیل نہ نکل آئے۔

اب جیل روڈ پر شادمان کالونی والے گول چکر کو صاف کر دیا گیا ہے اور فٹ بال کی ایک عمدہ گراؤنڈ تیار ہو گئی ہے۔ گول چکر کی وجہ سے یہاں ہم نے ٹریفک کو کبھی رکا ہوا نہیں دیکھا تھا مگر اب ہم جب بھی وہاں سے گزرے' لوگوں کو سگنل بدلنے کے انتظار میں جماہیاں لیتے دیکھا۔ ساتھ ہی بھاٹی دروازے کے سامنے کا گول چکر بھی اڑا دیا گیا ہے اور نیچے سے "پانی پت" کا میدان نکل آیا ہے' پیدل چلنے والوں کے لئے اس چوک کو عبور کرنا کارے وارد ہے۔ البتہ ان کے ایک کے بجائے پانچ چھ سر ہوں تو وہ ایک ایک کر کے انہیں ہتھیلی پر رکھ کر اس توقع پر چوک عبور کر سکتے ہیں کہ جب وہ پار پہنچیں گے تو ان کا کم سے کم ایک سر تو سلامت ہوگا۔

(۱۹۷۷ء)

لاہوری ٹریفک کے مسائل

لاہور میں ٹریفک کے بہت سے مسائل ہیں۔ آبادی میں اضافہ۔ آبادی کے ایک حصے کی "من فضل ربی" خوش حالی جو اپنے اعلان کے لئے سب سے پہلے ایک کار خریدتی ہے' چنانچہ کاروں میں اضافہ۔ بستیاں دور دور بسنے لگی ہیں اس لئے ٹیکسیوں اور رکشاؤں میں اضافہ۔ لوگ اپنے آپ کو بعض اخلاقی پابندیوں سے بے نیاز سمجھنے لگے ہیں اس لئے غیر ذمہ داری میں اضافہ۔ ان سب کے نتیجے میں حادثات میں اضافہ' اور ہسپتالوں والے بے چارے بہت عدیم الفرصت رہتے ہیں اس لئے اموات میں اضافہ۔ مگر ٹریفک کا ایک اور مسئلہ بھی ہے جس پر ٹریفک والے شاید اس لئے غور نہیں کرتے کہ غور کریں گے تو لوگ کیا کہیں گے۔ یہ سڑکوں پر گائیوں بھینسوں میں اضافہ ہے۔

گائے بھینس صوبائی دارالحکومت کے ٹریفک کا ہمیشہ ایک اہم حصہ رہی ہے۔ اہم اس لئے کہ نہ تو یہ مخلوق ٹریفک کے سپاہی یا اس کی سیٹی سے ڈرتی ہے اور نہ اسے انگریزی آتی ہے کہ وہ "کیپ ٹو دی لفٹ" کے الفاظ پڑھ کر بائیں ہاتھ پر چلے۔ یہ مخلوق لاہور کی سڑکوں پر یوں چلتی بلکہ ٹہلتی بلکہ مٹرگشت کرتی ہے جیسے پرانے زمانے کے فاتح فوجی' مفتوح شہروں کی سڑکوں پر بے نیازانہ گھومتے ہوں گے۔ مشین والے ٹریفک کو راستہ بنانا ہے تو خود بنالے۔ کاریں اور رکشائیں بھینسوں سے ٹکرا کر

اگر الٹ جانا نہیں چاہتیں تو بریکیں لگالیں اور گائیوں بھینسوں کے پیچھے ایک میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلیں کیونکہ آج تک کوئی ایسا ہارن ایجاد نہیں ہوا جو بجے تو گائے اور خاص طور سے بھینس کو خوفزدہ کرسکے۔ بلکہ کریہہ سے کریہہ ہارن بھی بجے تو بھینس اسے یوں شوق سے سنتی ہے جیسے لتا منگیشکر کا ریکارڈ لگ گیا ہے۔

ہم نے نسبت روڈ پر ایک دو منزلہ بس کو دیکھا کہ ایک بھینس کو بچانے یا اس سے بچنے کے لئے اس نے بریکیں لگائیں اور ہارن پر ہارن بجایا۔ بھینس پہلے تو استغراق کے عالم میں بس کے آگے آگے چلتی رہی' بلکہ کہیں کوئی چھلکا پڑا دکھائی دیا تو رک کر اسے سونگھتی بھی رہی۔ پھر جب بس کے اور اس کے درمیان صرف ایک انچ کا فاصلہ رہ گیا تو اس نے صرف سر موڑ کر بس کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اور پھر دوسری منزل پر اس کی نظریں گڑی گئیں۔ وہ شاید حیران ہو رہی تھی کہ زمانہ اتنی ترقی کر گیا ہے کہ بس پر بس سوار کر رکھی ہے۔

سب دیر تک بھینس کا مشاہدہ ختم نہ ہوا تو کنڈکٹر اترا اور اس نے بھینس کو ہانکنا شروع کیا۔ ہم نے دیکھا کہ بھینس کی تھوتھنی پر تبسم سا نمودار ہوا اور وہ ایک طرف ٹل گئی مگر ادھر سے دوسری دو منزلہ بس آگئی۔ اب کیفیت یہ تھی کہ بھینس کا سر ایک بس کے سامنے تھا اور پچھلا حصہ دوسری بس کے سامنے اور وہ اس صورت حال سے بے خبر مالٹے کے ایک چھلکے کو سونگھ رہی تھی۔ اس وقت خدا نے گوالے کو توفیق دی کہ وہ بھینس کو آکر نکالے۔ اس نے بھینس کو ایک طرف ہانکا تو سامنے سے ایک تانگہ آگیا۔ ادھر سے ایک اور تانگہ آگیا اور بھینس کا پیٹ ایک تانگے کے پہیے سے ذرا سی رگڑ کھا گیا۔ تب گوالا مرنے مارنے پر تیار ہوگیا مگر خدا بھلا کرے چند بھلے لوگوں کا کہ انہوں نے گوالے کو سمجھایا' بھینس کو پیار کیا اور "نسبت روڈ پر قتل" کی ایک خبر چھپتے چھپتے رہ گئی۔

صوبائی دارالحکومت کی بڑی بڑی سڑکوں پر رات کے دس بجے کے بعد متعدد گائیں عموماً نظر آجاتی تھیں مگر اب انہوں نے وقت کی پابندی ختم کر دی ہے۔ اب

وہ میکلوڈ روڈ اور مال روڈ وغیرہ کے چوراہوں پر سے ہر وقت گزرتی نظر آتی ہیں۔ بعض گائیں تو باقاعدہ سڑک کے عین وسط میں گڑ جاتی ہیں اور آتوں جاتوں کو کچھ یوں حیرت سے دیکھتی رہتی ہیں جیسے سوچ رہی رہیں کہ یہ کون سی مخلوق ہے جس کے دم ہے' نہ سینگ ہیں اور جو پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر یعنی الف ہو کر چلتی ہے۔

ہماری ٹریفک پولیس والے تانگوں' رکشاؤں اور ٹیکسیوں کی ذرا ذرا سی لغزشوں پر ان کا چالان کرنے میں تو خاصے "چاق و چوبند" ہیں مگر کیا انہوں نے کبھی ان گائیوں' ان کے بچھڑوں یا ان بھینسوں یا ان کے کٹوں کٹیوں کا بھی چالان کیا ہے جو اپنی ایک ہی لغزش مستانہ سے پورے ٹریفک کا بیڑا غرق کر دیتی ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ ان مویشیوں کے مالکوں نے ان کے رسے کیوں کھول دیئے ہیں کہ انہوں نے پورے لاہور کو اپنا تھان بنالیا ہے۔ کیا کارپوریشن نے انھیں کوئی اسی قسم کا لائسنس دے رکھا ہے اور کارپوریشن کا وہ ٹرک کہاں ہے جو سڑک کے کنارے کی رہیڑیوں اور چھابڑیوں کو نادر شاہی افواج کے سپاہیوں کی طرح سمیٹتا چلا جاتا ہے مگر سڑک پر گھومتی ہوئی یا کھڑی ہوئی گائیوں بھینسوں سے اسے بھی کترا کر نکل جانا پڑتا ہے۔

(۱۹۶۵ء)